جلد ۸
شمارہ ۶

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

فروری ۱۹۴۹ء

## صحنِ خیال



ماہنامہ
# افکار
بھوپال

زرِ سالانہ چھ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

:- نگراں :-
حکیم سید قمر الحسن

:- ادارہ :-
دُشتی - صہبا

## سنہ ۱۹۴۵ء کا کاروانِ ادب ثقافتی منزلیں طے کرتا سنہ ۱۹۴۸ء تک پہنچا!

——— اور پھر ایک سال بعد
ادب اور زندگی کی انقلابی قدروں
معاشی اور معاشرتی آویزشوں اور
عام انسانی تقاضوں کا جائزہ لینے کے لئے

# افکار کا

# خاص نمبر سنہ ۱۹۴۹ء

## اپریل میں شائع ہو رہا ہے !!!

خاص نمبر ——— میں ذیل کے فنکاروں کی شمولیت ——— اس کی تاریخی اہمیت کی ضامن ہے!

| | | | |
|---|---|---|---|
| جوش ملیح آبادی | ڈاکٹر عبدالحق | سید سلیمان ندوی | پنڈت سندر لال |
| کرشن چندر | عصمت چغتائی | احتشام حسین | رشید احمد صدیقی |
| آل احمد سرور | شریمتی وجے لکشمی پنڈت | | خواجہ احمد عباس |
| شاہد لطیف | مہندر ناتھ | مجروح سلطانپوری | ڈاکٹر مسعود حسین |
| اختر انصاری (دہلوی) | جاں نثار اختر | اسرار الحق مجاز | غلام ربانی تاباں |
| اودھو کمار | شوکت صدیقی | عبادت بریلوی | ساحر لدھیانوی |
| احسن علی خاں | کمال احمد صدیقی | حنیف فوق | اشتیاق عارف |
| حامد سعید خاں | انور عظیم | فکر تونسوی | صدیقہ بیگم |
| وامق جونپوری | دیویندر اسر | آنند نرائن ملا | ابراہیم یوسف |
| ظہور نظر | اختر سعید خاں | اختر ہوشیارپوری | اختر عرفانی |
| اسد بھوپالی | محمد علی تاج | قمر جمالی، | اور دوسرے! |

**خاص نمبر** ——— میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال منعقدہ ۲۵ تا ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کی تفصیلی کارروائی پڑھے جانے والے مضامین، نظم و نثر اور خطبات شائع کئے جائیں گے جن کے مطالعہ سے آپ ترقی پسند ادب کی ارتقائی رفتار — ادیبوں اور شاعروں کی تعمیری اور تخلیقی کوششوں اور قومی زبان کے مسئلہ پر کل ہند کانفرنس کے فیصلہ کی اہمیت کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔

**خریدار صاحبان** ——— خاص نمبر کو محفوظ طریقہ سے حاصل کرنے کا ذریعہ صرف رجسٹری ہے۔ اس لئے تمام خریداروں سے گذارش ہے کہ وہ خریداری نمبر کے حوالہ کے ساتھ چار آنے (۴؍) کے ٹکٹ روانہ فرمادیں۔ پاکستان میں رہنے والے خریدار حضرات کو یہ نمبر دفتر کی جانب سے بذریعہ رجسٹری بھیجا جائیگا، اور قیمت رجسٹری سالانہ چندہ میں شامل کر دی جائیگی۔ وہ ٹکٹ نہ بھیجیں، کیونکہ ہندوستان میں اُن کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

**ایجنٹ حضرات** ——— خاص نمبر کی جتنی کاپیاں ایجنٹ حضرات کو مطلوب ہوں اُس سے دفتر کو جلد از جلد مطلع فرمادیں تاکہ اُن کی کاپیاں محفوظ ہو سکیں۔ تاخیر کی صورت میں آرڈر کی عدم تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی —

ایجنٹ صاحبان کو خاص نمبر پر معقول کمیشن دیا جائیگا۔

**مشتہرین** ——— افکار کا خاص نمبر آپ کی تجارت و صنعت کی ترقی کا ایک مسلمہ ذریعہ بن سکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور پاکستان میں صرف افکار ہی وہ رسالہ ہے جسے دونوں مملکتوں کے پڑھے لکھے اور خوش حال گھرانے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ صفحات محدود ہیں اس لئے مشتہرین جلد دفتر سے تفصیلات معلوم کریں۔

مستقل خریداروں کو خاص نمبر سالانہ چندہ میں ہی ارسال کیا جائیگا۔ نئے خریدار بھی زر سالانہ چھ روپے چار آنے بھیجکر خاص نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

## یہ خاص نمبر:

(۱-۸-۰)

### تقریباً ۱۵۰ صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔

متعدد تصاویر ——— بہترین کتابت و طباعت

اچھوتا سرورق ——— جاذب نظر ترتیب

## افکار کا نصب العین

## ترقی پسند اور صحت مند ادب کی ترویج و اشاعت ہے!!

ضروری نوٹ :- مارچ کا شمارہ شائع نہیں ہوگا۔ خریدار اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں ———!!

**منیجر "افکار" بھوپال**

# اشاریہ

## کل ہند کانفرنس بھوپال

جنوری ۴۹ء کے آخری ہفتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کی جانب سے یہاں کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ بھوپال کی ادبی تاریخ میں یہ اجتماع ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے ہندوستان کے مختلف حصوں سے ممتاز اور مشہور ادباء و شعراء نے اس میں شرکت کی۔ جن میں سید سلیمان ندوی، پنڈت سندر لال، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، مجروح سلطانپوری، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، مہندر ناتھ، اودھو کمار، اور غلام ربانی تاباں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سردار جعفری کو اچانک حکومت بمبئی نے گرفتار کرلیا اور کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے جس کی وجہ سے کانفرنس ان کی شرکت سے محروم رہی اور ہر ایک نے ان کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کرشن چندر نے جو خطبہ پڑھا اس میں زبان کے مسئلہ پر نہایت مؤثر انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا

"یہ کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ اِدھر ملک آزاد ہوتا ہے اُدھر اُردو زبان قید کیجاتی ہے، اسے غدار، مردود اور گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے —— یہ کیسی آزادی ہے جس میں ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں آدمی اس زبان کو چھوڑنے پر مجبور کئے جارہے ہیں۔ یہ زبان جو ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کے جذبات کی زبان ہے نہ صرف جذبات بلکہ ان کے بازاروں، ان کے گلی کوچوں، کھیتوں اور کارخانوں کی زبان ہے۔ یہ کیسی آزادی ہے جو اس خوبصورت میٹھی زبان کا گلا گھونٹ رہی ہے —— اُردو جواہر لال اور مولانا آزاد کی زبان ہے۔ جس میں سردار پٹیل نے جیپور کانگرس میں تقریر کی ہے۔"

آخر میں کرشن چندر نے کہا:

"اُردو کی ایک اپنی سرکار بھی ہے اور وہ اُس کی جنتا ہے جو کروڑوں کی تعداد میں ہندوستان، برما، ملایا، سنگاپور اور مغربی افریقہ تک پھیلی ہے۔ یہ لوگ اسے بڑھائیں گے، پھیلائیں گے، زندہ رکھیں گے اور مذہبی جنون کا کوئی حربہ اسے نہیں روک سکتا ——"

اب یہ وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے کا نہیں۔ صرف عمل ہی سے ہم اپنی مہم میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اُردو کی خدمت کرنیوالوں کو اب تساہل اور غفلت کے دور سے نکل کر عملی شاہراہ پر گامزن ہو جانا چاہئے۔ اسی طرح ہم ملک کی اُن فسطائیت پسند عناصر کے زور کو توڑ سکتے ہیں جو عوامی ادب اور کلچر پر حملہ کر رہے ہیں۔

## خاص نمبر

افکار کا آئندہ شمارہ خاص نمبر ہوگا جس میں کانفرنس کی پوری کارروائی شائع ہوگی۔ "افکار" کی پالیسی کے بارے میں ہم بارہا ان صفحات میں لکھ چکے ہیں اور آج ہم پھر اس کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ "افکار" ترقی پسند ادب کا ترجمان ہے وہ رجعت پسندگی کو کسی بھی شعبۂ حیات میں پسند نہیں کرتا۔ ہم نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ صالح اور صحت مند ادب پیش کیا جائے۔ عوام کی جانب سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں —— نام نہاد آزادی کے بعد ان میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ اور ایسے وقت جبکہ انسان پر انسان کے جبر و استبداد کو روکنے کے لئے ساری دنیا کے جمہوری عناصر ایک ہوگئے ہیں اور سرمایہ داری کا مستقبل تاریک تر ہوتا چلا رہا ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادباء اور شعراء کو پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی تک مزدور محنت کش اور کسان اپنی محنتوں کا پورا صلہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور سامراجی طاقتیں برابر نت نئی چالیں چل رہی ہیں۔ ہمیں عوام دشمن طاقتوں کو کچلنے کے لئے بڑی سخت تنظیم کی ضرورت ہے۔ "افکار" پہلے بھی عوامی ادب اور تحریکات کی نمائندگی اور حمایت کرتا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی کرتا رہیگا۔ اس وقت ہم ایسے کٹھن اور دشوار گذار راستہ پر گامزن ہیں جو یقیناً ہمیں جمہوریت کے تابناک مستقبل کی طرف لیجاتا ہے۔

(ادارہ)

# سنگ و خشت

## دیرش

بھوپال میں ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کے لئے جو بمبئی گروپ آ رہا تھا، اُس کے لیڈر علی سردار جعفری کو روانگی سے ایک دن قبل بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا اور یہ گروپ اپنے "سردار" کے بغیر بھوپال پہنچا ——— کاش حکومت بمبئی "سخن فہمی" سے کام لیکر انھیں "پیرول" پر ہی بھوپال بھیج دیتی۔ ایسا ہو جاتا تو پھر ———

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

★

ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں بحیثیت صدر پنڈت سندر لال تقریر کر رہے تھے اور ہندوستانی زبان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اس کو ملک کی قومی زبان بنانے کے لئے پُرزور اپیل کر رہے تھے۔ آخر میں وہ اس قدر جوش میں آئے کہ تقریر ختم کرتے ہی ڈائس سے نیچے اترنے لگے۔ سکریٹری ڈائس سے ان کے پیچھے دوڑا۔ اور پیچھے سے خان شاکر علی خاں نے چلا کر کہا "ارے صاحب آپ تو جلسے کے صدر ہیں ڈائس ہی پر تشریف رکھئے" چنانچہ وہ فوراً پلٹ کر اپنی صدارتی کرسی پر جا بیٹھے اور ہال تالیوں کی صاعقہ پاشیوں سے گونج اُٹھا۔

★

سہ پہر کا اجلاس بشمبر ناتھ کی صدارت میں ہوا۔ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ حاضرین جا چکے تھے۔ البتہ کچھ ادیب اور شاعر چائے کے لئے رُک گئے تھے۔ کرشن چندر۔ مجروح سلطانپوری۔ تاباں، مہندر ناتھ۔ عادل صہبا، ارشد تھانوی، عصمت چغتائی، اور شاہد لطیف چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ قریب ہی عادل اور عصمت کی بچیاں بیٹھی تھیں، چائے آئی اتفاق سے سب لوگوں نے اپنی اپنی پیالیاں سنبھال لیں عصمت آپا کی بچی مچلنے لگی۔ اُنھوں نے اسے سمجھانے کے لئے کہا ان بچیوں (دونوں) کو پہلے چائے پی لینے دو پھر تم دو بڑے بعد میں پی لینا۔ اس پر سب لوگ بیساختہ ہنس پڑے۔

★

بارنج برنارڈ شا نے مصنفوں پر ٹیکس عاید کئے جانے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے برطانوی حکومت سے شکایت کی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ مصنف، شاعروں، نغمہ نگاروں، حسن کاروں اور ڈرامہ نویسوں کے ساتھ ساتھ گھوڑ دوڑ کے کھلاڑی سے کہیں زیادہ جان کی بازی لگا کر زندگی کا جوا کھیلتے ہیں۔ جواری ہی اچھے کہ وہ ٹیکس کی زد سے بچے ہوئے ہیں ——— پھر ہم کیوں یہ بھگتان بھگتیں ؟ ——— "

۹۲ سالہ شا شاید بھول گئے کہ برطانیہ انفلیشن کا انسداد کر رہا ہے۔ پھر وہ روشن دماغ اور ذہین لوگوں کو کیوں معاف کرے جو پیٹ کی خاطر اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیتے ہیں کیونکہ ان کے لئے زندگی خود ایک جُوا ہے جہاں ہار جیت کی کشاکش ہر لمحے نت نئے روپ بھرتی رہتی ہے۔

★

زکی انور صاحب نے بہار شریف سے دو لطیفے بھیجے ہیں ضیافت طبع کیلئے حاضر ہیں ——— صوبۂ بہار کے ایک مشہور طبقے کے معروف لیڈر کو کسی نے بتایا تھا کہ وہ ڈرائیوروں سے ہوشیار رہیں کیونکہ آجکل ڈرائیور، موٹر کے کل پُرزے چوری کر لیا کرتے ہیں اور بدل لیتے ہیں ——— وہ صاحب (لیڈر) رانچی جا رہے تھے، وہ اپنی کار پر ہی تھے۔ راستہ میں ایک جگہ گاڑی ایک دو سکنڈ کے لئے رک گئی اور ایک عجیب قسم کی آواز ہوئی۔ آپ نے فرمایا "کیا کر رہے ہو" ڈرائیور نے کہا "حضور گیئر بدل رہا تھا، مگر گریس کم رہنے کی وجہ سے آواز پیدا ہو گئی ——" لیڈر صاحب بہت خفا ہوئے کہ حرامزادہ چوری بھی کرتا ہے اور دلیری بھی۔ جب میرے سامنے گیئر بدل رہا تھا تو پیچھے کا خدا حافظ دوسرے روز ڈرائیور نکال دیا گیا ——— سنا ہے انھیں ایسے ڈرائیور کی تلاش ہے جو بغیر گیئر بدلے ہوئے گاڑی چلا سکے۔

یہی لیڈر صاحب اپنے طبقے کے بڑے بڑے لوگوں اور اپنے طبقہ کی دیم ال ٹلے صاحبان کی ایک کانفرنس میں تقریر کر رہے تھے ——— آپ نے فرمایا ——— "دنیا ترقی کر رہی ہے اب ہمیں بھی جلد سے جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانا چاہئے۔ زیادہ دیر تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا ہمارے لئے اچھا نہیں۔ ہمیں بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہئے" سامعین نے

## حنیف فوق

# جہانِ تازہ....

"ہماری زمین بھی ایک سیارہ ہے اور دوسرے سیاروں سے مشاہدہ کرنے والوں کے لئے ممکن ہو کہ ویسی ہی روشن اور تابناک ہو جیسے ہمارے لئے دوسرے اجرامِ فلکی ہیں" (ٹالسٹائی)

ایک زمانہ گذرا کہ چاند اور سورج کے طلوع و غروب نے ہماری چشمِ بینا کو کسی عظیم حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا اور ہمیں "محسوس" میں "غیر محسوس" کی جھلک نظر آئی تھی۔ آج ہم نے چاند ستاروں سے نظریں ہٹا کر صرف اس کرۂ ارضی کو اپنا مرکزِ توجہ بنا لیا ہے۔ اب ہم ستاروں کی گذرگاہوں میں اُلجھنے کے بجائے اپنی منزل کی جانب گامزن ہیں۔ پھر بھی جانے کیوں خیال کی تاریکیوں میں منزل کی جھلک موہوم ہوتی جارہی ہے۔ کیا یہ اس لئے تو نہیں کہ نظریں راہ کے خس و خاشاک میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں اور "نارِ نمرود" کو "گلزارِ خلیل" بنادینے کی صلاحیت کھو چکی ہیں۔

ہنگاموں کی اس دنیا میں ہمارا دامن کشاں گذر جانا تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہنگامہ پرستی سے ضرور گریز کیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ ہند کے شاعروں، صورتگروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ لیکن ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہونے کا نتیجہ صرف "ادبِ لطیف" ہو سکتا ہے۔ مگر خوبیٔ قسمت سے کسی ادیب کے ذہن پر "ہنگامہ" سوار ہوجائے تو تصور کیجئے کہ وہ ادب کے ایوانوں میں کیا کیا ستم نہ ڈھائے گا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حال کے ہنگاموں نے لکھنے والوں کے ذہن پر ایسا ہی "ہنگامہ آفریں" اثر کیا ہے۔ ان کا ذہن جیسے تشدد اور بے رحمی کے ان خطرناک لمحوں کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ اب ان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب بھی کسی ہنگامے کے، خواہ وہ نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی۔ قائل تھے۔ لیکن ان کے پیشِ نظر "گھر کی رونق" تھی محض ہنگامہ پرستی نہیں۔

دراصل "خس و خاشاک" میں اُلجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ذہن میں منزل کا تصور صاف نہیں ہے۔ اگر پیشِ نظر کوئی جلوہ گاہِ حسن ہو تو یوں راہ میں پیش آنے والے معمولی یا غیر معمولی واقعات کی وجہ سے رُک کر وقت ضائع کرنے کا خیال کسی کو نہیں آئے گا۔ اور پھر شاید اس کا امکان بھی نہ ہو کہ ان حادثات ہی کو ذوقِ سفر کا حاصل سمجھ لیا جائے۔ درحقیقت کسی واقعہ کو زندگی کی مجموعی ہیئت سے الگ کر کے دیکھنا، تنگ نظری ہے۔ ہنگامی ادب کے ہنگاموں میں چند لمحوں کے لئے رک کر یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ ہم اس تنگ نظری کا شکار تو نہیں ہو رہے ہیں۔

ادب میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی ہزارہا کیفیتوں کے علاوہ زندگی کے ساز کے چھیڑے ہوئے اَن گنت نغمے ملتے ہیں۔ حافظ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی روحانی اشارہ چپکے سے ہمارے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ غالب فلسفۂ حیات کی تشریح کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ حقیقت اور مجاز میں فرق باقی نہیں رہتا۔ اقبال کی آواز اُن کے "ذوقِ یقیں" کی حامل ہے اور درسِ خودی دیتی ہے۔ اختر شیرانی نے اپنی جوانی کی رنگینیوں اور سرمستیوں سے رنگ اور حرارت کا اکتساب کر کے سلمیٰ کے پیکرِ رنگیں کو (جو شاید اُن کے تصور کی بے باک تخلیق ہے) حیاتِ دوام بخشنے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی مذہبی عقیدت نے بھی شاعرانہ خوابوں کے گہوارے میں پرورش پائی ہے۔ ہندی شاعری میں "رس کھان" کی کرشن جی سے والہانہ عقیدت کی داستان اس

اُردو میں مجنوں کا کورؔدی کے مختلف اوقات میں جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ ناساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ذہنی طور پر مغلوب نہیں ہو گئے تھے۔ یہاں یاسیت اور ذہنی پسپائی میں جو فرق ہے اُسے دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ کی شاعری میں غم کے عناصر کی فراوانی ہے مگر یہ غم ان کی فطرت میں گہرائی اور کردار میں بلندی پیدا کرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں وہ کسی سرسامی کیفیت میں مبتلا نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف آج کے بعض لکھنے والے زندگی کے ہنگاموں سے (جو تاریخ سے باخبر انسانوں کے لئے کچھ نئے نہیں ہیں) اس درجہ سراسیمہ ہوئے ہیں کہ تناسب اور توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔

حافظؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور اختر شیرانیؔ سب کے ذہنوں میں حیات کا ایک واضح تصور موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بدلتے ہوئے حالات اور نفسیات کے تغیّر کے ساتھ ساتھ اس تصورِ حیات میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی صورت میں یہ تصور اُن کے ذہنوں میں باقی رہتا ہے۔ حافظؔ کی نظریں رُک کر اشیاء اور موجودات کا جائزہ نہیں لیتیں۔ لیکن کونین کی وسعتوں پر محیط ایک

رموزِ عشق و مستی زمن بشنو، نہ از واعظ ❊ کہ با جام و قدح ہر شب قرینِ ماہ و پروینم۔

کہنے کا سلیقہ اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ میں اتنی بلند نظری ہے کہ وہ کھلے لفظوں میں "غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں" کا اعتراف کر سکتے ہیں۔ اقبالؔ جہد و عمل کے پیغامبر ہیں اور یزداں گیری کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان شعرا کے مقابلے میں اختر شیرانیؔ کی رومانی دنیا جس کی ابتدا اور انتہا محبت ہے۔ کچھ محدود نظر آتی ہے۔ مگر اس میں قابلِ غور امر یہ ہے کہ اختر محبت کی جس رومانی کیفیت کو جس میں جسمانیت کی لے بہت کچھ مدھم ہو جاتی ہے لے کر آگے بڑھے ہیں۔ اس نے حیات کے تقاضوں سے اپنا رشتہ منقطع تو نہیں کر لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے اور "اے عشق کہیں لے چل" کی خواب آلود آواز بھی اپنے جلو میں زندگی کی تلخیوں کا کارواں لئے ہوئے ہے اس کے علاوہ اختر شیرانیؔ جب کہتے ہیں کہ ؎

مٹا سکے گا نہ اب دورِ آسماں مجھ کو ❊ نصیب ہے کہ ترا عشق نوجواں مجھ کو

تو ہمیں اس رومانی عشق میں بھی ایک انقلابی طاقت اور قوت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف موجودہ ہنگاموں پر بعض لکھنے والوں نے اپنے کان زندگی کی آوازوں کے لئے جیسے بالکل بند کر رکھے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلتی بھی ہیں تو صرف نئے ہمہ گیر مشاہدے کی خاطر۔ وہ نہ حقیقت کو دیکھتے ہیں اور نہ اُن کے تصورات میں وہ گرمی اور خلوص کی شدت ہے کہ تصور حقیقت کے قالب میں ڈھل سکے۔ ہاں سستی جذباتیت اور رقت پسندی (Sentimentalism.) چاہئے تو ڈھیروں لے لیجئے۔ لیکن اس طرح پڑھنے والوں کے ذہن پر کوئی اثر پڑتا بھی ہے تو وہ فوری اور وقتی ہے، گہرا اور دیرپا نہیں۔ حالانکہ اعلیٰ ادب کا مقصد وہی دل میں اتر جانے والی گہری اور میٹھی کسک ہے۔

زندگی کے وسیع اور عریض صحرا میں بے قرار روح کی مانند بھٹکنا اگر شیوۂ دانائی نہیں ہے تو یہ بھی شاید مقتضائے عقل نہ ہو کہ نظریں تپتے ہوئے ریگستان کے سوا کچھ اور نہ دیکھ سکیں۔ مزید براں جب اس ریگستان میں بھی بہت سے نخلستانوں کا وجود زندگی کو کم از کم قابلِ برداشت بنائے ہوئے ہے۔ پھر اس صحرا میں صرف تپتے ہوئے ریگستان ہی نہیں لہلہاتے ہوئے شاداب مرغزار اور ٹھنڈے پانی کے سرچشمے بھی ہیں۔ یقینی طور پر یہ سب کچھ وہ نہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کانٹ چھانٹ کرنا ہے۔ بہت سے جنگلوں کو صاف کرنا ہے، بہت سی خندقوں کو پاٹنا ہے، اور زندگی کے نرم و نازک پودوں کی آبیاری کے لئے بہت سی نہریں کاٹنا ہے۔ مختصر یہ کہ ابھی ہمیں ہزار طریقوں سے عروسِ حیات کی زلفوں کو سنوارنا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم زندگی کے سرچشموں میں نفرت کا زہر گھل جانے دیں۔ کیونکہ اگر ایک جانب سرمایہ دارانہ نظام کی تیز دھوپ نے روح کو جھلسا دیا ہے تو دوسری جانب اس جھلسی ہوئی روح کو

فرحت بخشنے کے لئے محبت کی نرم اور خوشگوار چاندنی بھی موجود ہے۔ یہ نظام خواہ کتنا ہی ہلاک کیوں نہ ہو ہماری بنیادی انسانیت کو فنا نہیں کر سکا اور ہمارے ادیبوں کو یہی عزم محکم لے کر آگے بڑھنا ہے۔

دراصل ساری بحث کا انحصار اب صرف اس بات پر رہ جاتا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں انسان کا تصور کیا ہو۔ کیا واقعی انسانیت مسخ ہو کر پھر ارتقاء کے اس دور میں لوٹ گئی ہے جب انسان کے آباؤ اجداد مزے سے درختوں کی شاخوں میں جھولتے رہتے تھے یا ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان مارتا، لوٹتا، جلاتا، قتل و غارتگری پھیلاتا اور بہت سے بہیمانہ افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا یہ سب اسی فطری انداز میں کرتا ہے جس فطری انداز میں چیتا اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ یا بھیڑیا بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ آور ہوتا ہے؟ یقینی طور پر ایسا نہیں ہے۔ اور انسان کا تصور کپڑے پہنے ہوئے، ہلاک ہتھیاروں سے مسلح محض ایک جانور کی حیثیت سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہت سے احساسات کا مجموعہ ہے اور حالات مدتے اُس پستی کی جانب بھی کھینچتے ہیں جو دراصل اس کا صحیح مقام نہیں ہے۔ ہمیں اس کا اس لحاظ سے بھی جائزہ لینا ہے اور سیاستدانوں کی طرح اس تنگ نظری کا شکار نہیں ہو جانا ہے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔

سیاستدانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اگر ہم ایک لحظہ غور کریں تو ہم پر عیاں ہو جائے کہ اُنھوں نے کس طرح انسانوں کی ایک عمر، نفع کے بازار میں فروخت کیا ہے۔ اور سیاست کی منڈی میں کچے مال کی طرح بیچ کر اپنا اُلو سیدھا کیا ہے۔ اس کے علاوہ آج بھی ترغیب، تحریص اور تعزیر کے تمام ممکن ذرائع کام میں لے کر وہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہیں ہم پر سیاسی اور ادبی نقطۂ نظر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاست نے اپنے اور اپنے گروہ کے فائدے کی خاطر ہندوستان میں ایک قومی اور دو قومی نظریے کی ترویج کی۔ لیکن ادب نے ہمیشہ تمام انسانوں کی بنیادی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا اور دہلی، صفاہان اور سمرقند کی تمیز نہیں کی۔ اس طرح ادیب کا سماج میں خود اپنا مقام ہے۔ جو سیاستدوں کے مقام سے بہت جدا ہے آج طبقاتی کشمکش اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے اور ادیبوں کو اس طبقاتی تضاد کا شدید احساس ہے لیکن اس شدتِ احساس کی بنا پر انھیں نہ تو اپنے منصب کو فراموش کرنا ہے اور نہ سیاستدانوں کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود زندگی کا براہ راست مطالعہ کریں محض ترقی پسندی کا لیبل لگا کر اعلیٰ ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح صرف نفرت کے منفی جذبے سے بھی کام نہیں چلے گا۔

اس ظالمانہ نظامِ زر کو بدلنے کے ساتھ ساتھ اگر انسانی محبت، انسان دوستی اور انسانیت پر اعتماد کا مثبت احساس ذہن میں نہیں ہے تو ہم ادب کے صحیح مقام سے آشنا نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ حالات بدلے جا سکتے ہیں لیکن انسانیت (جاگیردار، بورژوا اور پرولتاری کے خانوں میں بھی تقسیم نہیں کی جا سکتی ہے) ٹینی سن (Tinnyson) نے بہت صحیح کہا تھا کہ

"And he that shuts love out, in turn shall be shut out from love"

اور اس منزل پر پہنچ کر ادب ہی نہیں ادیب کی بھی ذہنی موت واقع ہو جاتی ہے کیونکہ زندگی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ دراصل ادب کے شاہکار۔ خواہ وہ پراچین بھارت میں کالیداس کا شکنتلا ہو یا عصرِ رواں کی ترجمان ٹالسٹائی (Tolstoy) کی "جنگ اور صلح" (War & Peace) ادب اور انسانیت کے اعلیٰ تصور کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ ہمیں اس تصور کی روشنی میں اس طرح قدم آگے بڑھانا ہے کہ ستاروں کی نظریں جھک جائیں ۞

زنجیرِ پا
شمع آزادی
زنگ
دولت نایافت سے
معیارِ محبت
عہد شکیل
شکستگی
نئے آثار
دو غزلیں

# آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

# زنجیرِ پا

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

ہر نگہہ کو طبعِ نازک پر گراں سمجھا تھا میں
وہ بھی کیا دن تھے جب اس کو بدگماں سمجھا تھا میں

بے حجابی کو حجاب درمیاں سمجھا تھا میں
سامنے کی بات تھی لیکن کہاں سمجھا تھا میں

زندگی نکلی مسلسل امتحاں در امتحاں
زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھا تھا میں

یاد ہے کہ جب ذوقِ طلب کامل نہ تھا!
ہر غبارِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں!

اُس گھڑی کی شرم رکھ لے اے نگاہِ نازِ دوست
ہر نفس کو جب حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے
چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

پردہ اُٹھا تو وہی صورت نظر آئی جگر
مدتوں روح القدس کو ہم زباں سمجھا تھا میں

جگر مرادآبادی

# شمعِ آزادی

جہانِ آب و گِل، اربابِ جاں کی آزمائش ہے
یہ بتخانہ ترے حُسنِ گماں کی آزمائش ہے

ستاروں پر مدارِ رہبری تھا ظلمتِ شب میں
قریبِ صبح خضرِ کارواں کی آزمائش ہے

سہارا لے لیا ہے زندگی کے فکرِ درماں کا!
سکونِ دردمندانِ جہاں کی آزمائش ہے

حرم نادیدہ، بتخانہ گریزاں، ہر برہمن رہبر!
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے!

زمانہ کا تغافل ہو کہ خود اپنی کم آمیزی
بہرصورت خلوصِ دوستاں کی آزمائش ہے

بہار آتے ہی حُسنِ لالہ و گُل خود عیاں ہوگا
خزاں جبتک ہے خاکِ گلستاں کی آزمائش ہے

بہت میں نے ستم ہائے جہاں کے ناز اٹھائے ہیں
مری آشفتگی، سارے جہاں کی آزمائش ہے!

تغافل کی حدوں سے بڑھ گیا ہے کوئی دیوانہ
اب اُن کے التفاتِ ناگہاں کی آزمائش ہے

غمِ ہستی سکوتِ مرگ سے مانوس کیا ہوتا؟
خداوندا حیاتِ جاوداں کی آزمائش ہے!

کٹی ہے زندگی کی رات آنکھوں میں مگر خوش ہوں
یہ بیداری کسی خوابِ گراں کی آزمائش ہے

زمانہ جس کو سمجھا امتحانِ صبرِ مجبوری!
وہی دراصل عزمِ کامراں کی آزمائش ہے!

گریزاں ہو رہا ہے دامنِ شب، شمع لرزاں ہے
یقینِ وعدۂ نامہرباں کی آزمائش ہے!

بہت ہی سرگراں ہیں شعلہ ہائے شمعِ آزادی
رَوِش اب دامنِ ہندوستاں کی آزمائش ہے

روش صدیقی

# زنگ

آج بھی چھائی ہوئی دہر پہ ہے شامِ ابد
آج بھی حسن کے چہرے پہ دھوئیں رقصاں ہیں

یہ وطن عصمت و عفت کا نگہبانِ وطن
اس میں تہذیب و تمدن نے نمو پائی ہے
جس نے اِن بند دریچوں پہ اٹھائیں آنکھیں
اس نے گستاخ نگاہی کی سزا پائی ہے

اب بھی تاریخ کے اوراق ہیں نازاں اس پر
کہ ہے مشرق کی یہ دوشیزہ خاکی پتلی
اس گھروندے میں گزر جاتی ہیں کتنی صدیاں
اک قدم بھی نہ یہ دہلیز سے باہر نکلی

لیکن اے دوست! یہ منظر میں کہاں لیجاؤں
میرے کانوں سے ہے ٹکراتی وہ غمناک ہنسی
میں تو بن جاؤں بھی اجداد کی عظمت کا امیں
قہقہے ان پہ لگاتی ہے ہوس کی دیوی

یہ حویلی، یہ حرم اور یہ اونچی دیوار
آج بھی اِن میں سسکتے ہیں دلوں کے نغمے

نہ فضاؤں کا تبسم نہ ہواؤں کا خرام
اب بھی بیتاب ہیں ہلنے کو حریری پردے

یہ شرافت کے محافظ یہی مردانِ خدا
خود تو لیتے ہیں یہ رومان کی وادی میں پناہ
اِن کو بس آلۂ تخلیق سمجھ بیٹھے ہیں
ان کو اس رہ پہ تصور میں بھی جانا ہے گناہ

"ادھ کھلے پھول" مہکنے کی ہوس میں دن رات
انھیں گھٹتی ہوئی سانسوں میں بسر کرتے ہیں۔
لوٹ کر چند دنوں زہرہ جبینوں کا سہاگ
کب خدایانِ مجازی پہ نظر کرتے ہیں

حسنِ مریم پہ یونہی زنگ سا لگ جاتا ہے
دورِ تقدیس ہم آغوشِ خزاں ہوتا ہے۔
جس کو مذہب نے بتایا تھا شریکِ ہستی
ان کی تقدیر کا مالک وہ کہاں ہوتا ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

جب تاریکی دور ہوئی

لامتناہی سلسلہ

رات

ردِ عمل

# آبشار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

زکی انور

# جب تاریکی دور ہوئی

"یہ بھی عجیب قسم کا کرفیو ہے۔ مستقل لعنت ہی تو ہے۔ سو فیصدی بے بسی۔ میں للتا کو دیکھ نہیں سکتا، وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی۔ نہ میں برآمدے میں جا سکتا ہوں اور نہ وہ باہر چھت پر آ سکتی ہے۔ بس صبح سے دس بجے تک کمرے میں بند رہوں۔ دس بجے جب وہ کالج چلی جائے تو ڈربے سے نکلوں۔ اُس وقت سے چار بجے تک اِدھر اُدھر گھوم سکتا ہوں، شہر جا سکتا ہوں۔ مگر کالج روڈ سے نہیں اور نہ ڈان اسٹریٹ سے۔ چار بجے سے پھر ڈربے کے اندر ــــ کھڑکیاں بند، اور کھڑکیوں پر نیلے رنگ کا جو پردہ ہے، سرکنے نہ پائے۔ رات کے وقت بھی باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اگر سگریٹ کی خواہش ہوئی۔ ضرور توں کا بہانہ کیا۔ جلدی جلدی دو تین کش لگائے اور پھر بھائی جان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب پر جُھک گیا ــــ اُف کیا مصیبت ہے، قسم اُس ذات پاک کی دنیا میں جہنم"

سوچتے سوچتے اُس کا دماغ بِکھلانے لگا۔ کمرے کی تمام کھڑکیاں اُس نے جکڑ رکھی تھیں۔ کمرہ بالکل اندھیرا تھا ــــ بس سگریٹ کا دھواں، تاریکی اور اُلجھے ہوئے خیالات۔ اُس کا دم جیسے گھُٹ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ تمام کھڑکیاں ایک ایک کرکے کھول دے۔ اور چلا چلا کر کہے ــــ "ہم کرفیو آرڈر نہیں مانتے، ہم تمہارا قانون نہیں مانتے، ہم عدول حکمی کریں گے، ہم بغاوت کریں گے" ــــ اور پھر اس زندگی اور موت میں فرق ہی کیا ہے؟ اندھیری قبر ہی تو ہے، نہ ہوا نہ روشنی ــــ اور اُس نے سوچا کہ اگر میں نے ثواب کے کام کئے ہوتے تو آج باغ رضواں سے میرے لئے ہوا ضرور سپلائی ہوتی۔ مگر میں نے گناہ ہی کیا کیا تھا۔ للتا سے ملتا تھا بس یہی نا۔ ہم میں ناجائز تعلقات تو تھے نہیں ــــ مگر کمرہ قبر ہی بنا رہا۔ اور وہ مُردہ، کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ البتہ اُس کے دماغ میں ایک آواز گونجنے لگی ــــ "تیرا ربّ کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟" ــــ میرا رب؟ وہ چونکا اور سوچنے لگا۔ میرا رب کون ہو سکتا ہے۔ محکوموں کا رب؟ کوئی بھی تو نہیں ہوتا ــــ کوئی نہیں، اور دین؟ میں نے کسی مذہب کے آدمی سے دشمنی نہیں کی ــــ پھر میرا دین کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ نہیں کوئی مذہب نہیں۔ مگر وہ آواز پھر گونجی جیسے اُس کے ذہن پر وہ آواز چھائی ہوئی تھی ــــ "ہاں۔ میں انسانیت کا پیرو ہوں، میں انسان ہوں، بس اس سے آگے کچھ نہیں ــــ میں دنیاوی خدا کو نہیں مانتا۔ اُس خدا کو نہیں جو بلوا کراتا ہے، فساد کراتا ہے ــــ میرا خدا، میرا خدا میرا اصلی معبود ہے ــــ" اور آواز بند ہو گئی، پھر وہی قبر کی سی تاریکی۔

ہاں ہاں، بغاوت کرنا ہی ہوگی، آخر ہم اس طرح قبر میں کب تک پڑے رہیں گے؟" مگر دوسرے ہی لمحہ اُس کے دماغ نے پلٹا کھایا۔ ــــ "نہیں، نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ خواہ میرے گوشت پوست، قبر میں پڑے پڑے مٹی کیوں نہ بن جائیں مگر میں ایسا ہرگز نہیں کر سکوں گا۔ بھائی جان مجھے کتنا پیار کرتے ہیں۔ اور آج اُسے یہ احساس ہوا کہ اقبال نے سراسر غلط کہا تھا اُس نے زہر اگلا تھا اُس نے آقاؤں اور خادموں کے درمیان نفاق کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اُس نے کتنے ہی محکوموں کو حاکموں سے سرکش کر دیا تھا۔ ہُنہ ــــ اس رزق سے موت اچھی، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ــــ واہ جی کیا فرمایا ہے آپ نے، سبحان اللہ قربان جائیے ــــ چھی چھی ــــ کتنی غلط ترتیب ہے۔ کیسی غلط تعلیم دی گئی ہے ــــ اور وہ شاعروں کے متعلق سوچنے لگا۔ یہ جتنے مشہور شاعر ہیں سب کے سب تو اسی قسم کی بے کار باتیں کیا کرتے ہیں۔ جیسے اور کوئی موضوع ہی تو نہیں ملتا۔ ہندوستان کا ترانہ لکھیں، آزادی کے گن گائیں، کتنے اچھے اچھے ترانے ہیں۔ مگر انھیں تو جیسے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ایک صاحب رزق کو ٹھکرا کے

تعلیم دے کر مر گئے۔ دوسرے چلانے لگے ہندو مسلم ایک ہیں ؎

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا ٭ پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

— جی ہاں ہندو مسلم ایک ہیں! کیا جہل سی بات کہی ہے ظالم نے — دور نام دس گز کا — شاعر انقلاب، وقت کا پیام ...... اور کیا کیا ہیں۔ لیکن معمولی سی بات معلوم نہیں کہ ہندو مسلم ایک ہیں یا دو — کیا جواب ہے اس بکواس کا — ہندو مسلم ایک ہیں — واہ جی واہ جی کہاں سے دو آئے۔ ہندو مندر میں عبادت کرتا ہے۔ مسلمان مسجد میں، ہندو گائے کو ماتا جی کہتا ہے اور مسلمان اُسے ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ ہندو کا خدا اور مسلمانوں کا خدا اور — ہندو کا بھگوان اوتار لے کر [illegible] اپنی ماتا جان کی پیٹھ پر سوار ہوتا ہے اور سرپٹ دوڑاتا ہے بھاگا جاتا ہے۔ اور مسلمان کا خدا گھنٹے کی آواز سے نفرت کرتا ہے۔ اور یہ موجودہ شاعر لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر یہ دونوں ایک ہوتے تو پھر تو دین، اسلام زندہ کرنے اور بھگوان کو خوش کرنے کی ضرورت ہی کیوں ہوتی؟ دنگا، فساد — مگر کچھ بھی ہو یہ دنگا فساد ہے بڑے کام کی چیز — قوم جنگ جو بنتی ہے۔ اپنی اپنی دعا کا بھی موقع ملتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہوتی ہے کہ آبادی کا ایک حصہ تو کم ہوتا ہے۔ ویسے ہی تو ملک میں ضرورت کی تمام چیزیں نایاب ہیں۔ آج انڈونیشیا سے گھوڑے کے دانت جیسے بڑے بڑے مکئی آ رہے ہیں۔ تو کل برما سے چاول، کہیں سے کپڑا بھیک مانگا جا رہا ہے تو کہیں سے کچھ اور۔ اگر خدا اور بھگوان اپنے اپنے چیلوں کو چھوڑ کر بھاگ نہ لگ جائیں، دھرم اور مذہب، سنکٹ اور خطرے میں نہ پڑ جائے اور ہندو مسلمان بآواز بلند نعرہ لگا کر خدا اور بھگوان کو واپس نہ بلانے لگ جائیں — او جانے والے بالموا — لوٹ کے آ، اور جواب ملتا ہے — جا میں نا تیرا بالموا — بے وفا، بے وفا، بے وفاؤ، دنگا کرو، فساد کرو، ہمیں پھر سے زندہ کرو ورنہ ہم واپس نہیں آتے — بولو جے رنگ بلی کی جے — نعرۂ تکبیر اللہ اکبر — یہ مرا، یہ مارا، وہ شہید، وہ سُرگ باش — ایک، دو، دس — سو، ہزار، پانچ سو — پھر کرفیو آرڈر — مگر کیا ہوا؟ اچھا ہی تو ہوا۔ اگر یہ مرا نہ کریں اور اگر بھابی جان جیسی کروڑوں عورتیں دنیا میں موجود رہیں جب تو ہندوستان کا اللہ ہی حافظ ہے چاول سونگھنے تک کو بھی نہیں ملے۔ آج کو تو اتنی بات ہے — رہے نام بلیک مارکیٹ کا — کچھ نہ کچھ مل تو جاتا ہے۔ لیکن اگر آبادی نہیں گھٹے، اور ہر سال کروڑوں بھابی جان جیسی عورتیں سالانہ نمبر شائع کرتی رہیں جب تو قحط عظیم آ جائے۔“

اور اُس نے سوچا — یہ بھابی جان بھی عجیب ہستیاں ہیں۔ ہر سال ایک نیا اجرا بھی ناغہ ہی نہیں ہوتا — جیسے ”دیپک“ کا سالگرہ نمبر ہی تو ہے۔ لیکن ”دیپک“ ہے — دیپک — یہ بھی بہت مشہور رسالہ — جنگ کے زمانے میں اس بیچارے کی ضخامت کم ہو گئی، ہاں یوں دبلا ہو گیا۔ حکومت نے کاغذ میں بہت تخفیف کر دی۔ اور بیچارے جمنداس نے تو جیسے تیسے کر کے چند روز، اور ”میری جان فقط چند ہی روز“ — لیکن یہ چند روز تو ختم بھی ہو گئے۔ اور ”میری جان“ رخصت بھی ہو گئی۔ تو پھر کیا ہوا — سویرا بند — ادب لطیف بند — نقوش بند — بند بند بند، اچھا ہوا حکومت نے بند کر دیئے۔ بہت خوب ہوا۔ یہ بے کار سے کار پرچے۔ بس وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔ غریب، امیر، مزدور، کسان، سرمایہ دار۔ اور دوسری طرف ”دیپک“ — ”بھارت ورت“ — ”کوشان“ — ”فلم سنسار“ — کیا مجال جو ان پرچوں کا بال بیکا ہوا ہو۔ جنگ کے زمانے میں بھی برابر نئے نئے نمبر نکلتے ہی رہے۔ عید نمبر، ہولی نمبر، ایکٹرس نمبر، افسانہ نمبر، اور ایسا ہو بھی کیوں نہیں آخر قحط کے زمانے میں بڑے بڑے لوگوں پر بھی قحط کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ عید منائی جا رہی تھی، ہولی منائی جا رہی تھی [illegible] دیوالی سب ہی کچھ تو تھا۔ تھوڑے سے ہی وہ کنگال تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا، موج اڑاتے [illegible] قحط زدہ عورتوں پر انھیں رحم آنے لگا تھا۔ اور اکثر روٹی، ساری، دوپٹہ [illegible] کے لئے نوکر سے انھیں بلوا لیا کرتے تھے۔“

کرفیو آرڈر — فساد — قانا — دیپک — ادب لطیف ...... آہ یہ اپنے خیال تو کر [illegible]

"کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ ڈاک ساب"

اُس نے کھڑکی کھول دی۔ ڈاکئے نے چند خطوط، ایک اخبار اور دو تین معمولی معمولی، قحط زدہ بھوکوں جیسے رسالے اُس کے حوالے کر دیئے۔ جن کی ہیئت میں جنگ ختم ہو جانے، میری جان کے دفعہ ہو جانے اور اپنی آزاد حکومت ہو جانے کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی معمولی سا سرِ ورق، وہی رف کاغذ اور اُسے محسوس ہوا کہ کنگال اب تک اپنی دھنسی دھنسی آنکھیں اور مکروہ جسم لئے رینگتے پھر رہے ہیں۔ اور اُسے بھائی جان پر قدرے غصّہ بھی آیا۔ آخر وہ ایسے ایسے پرچے پڑھتے ہی کیوں ہیں؟ نہ صورت نہ شکل، کہیں لے کر گھوما جائے تو اپنی بے عزّتی ـــــ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اگر کنگالیوں کے دل اندر بیٹھ کر دیکھئے تو آپ کو احساس ہوگا کہ "بابو" کہہ کر عاجزی کے ساتھ ہاتھ بڑھا دینے والا حقیر بھکاری اپنے دل میں "بابوؤں" کے خلاف عجیب عجیب باتیں سوچا کرتا ہے۔ جیسے "بابو" کو کچا ہی تو نگل جائیگا۔ ٹھیک یہی حالت ہے ان خستہ حال رسالوں کی، پڑھئے تو بس ہنسی آئے گی ـــــ یہ آزادی، "آزادی" لفظ کی توہین ہے ـــــ کون آزاد ہوا، کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی ـــــ ہمیں سرمایہ داروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت ہے ـــــ خوش حالی کی زندگی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ وغیرہ ـــــ بھئی واہ گز بھر کی زبان ہے، بکے جاؤ، اور اگر حکومت پرچہ ضبط کرے، ضمانت طلب کرے تو نانی یاد آجائے۔ یہ بھی کوئی رسالہ ہوا؟ شریف آدمیوں کے پڑھنے کا ـــــ کیا پتہ ہے حکومت پڑھنے والے کو بھی پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت بٹھیں دے۔ پرچے تو ہیں، "دیپک" "کوشیان" "بھارت ورت" "فلم ساؤنڈ" ـــــ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ اور یہ پرچے؟ کتنا پست ذوق؟ نہ سرِ ورق پر کسی حسین ایکٹرس کی تصویر، نہ اندر عشاق کے خطوط، ہماری ڈاک، سوال جواب ـــــ نسیم کب تک چلے گی، بیگم پارہ کا کون سا مہینہ ہے میں مٹھائی بھیجوں گا، ان ایکٹرسوں کو اُن کے سینے کے لحاظ سے نمبر دیجئے۔ وغیرہ اور پھر فلموں پر عمیق تبصرہ، مدلل بحثیں ـــــ

مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ثریا بانو کی معیاری نظمیں اور افسانے نہ کوئی اور ہی پڑھنے کا کالم۔ اُس نے بے دلی سے انھیں پٹک دیا۔ مگر ایک پرچے کو ابھی اُس نے نہیں کھولا تھا۔ وہ اب تک میز پر لپٹا ہوا پڑا تھا۔ اُس نے پیکٹ اٹھا لیا۔ جھٹ سے اُسے کھولا۔ نظام بمبئی ـــــ سرِ ورق پر تصویر تو تھی مگر ملاحظہ فرمائیے دو بھکاریوں کی۔ اُسے ہنسی ـــــ آنے لگی، جیسے ہندستان میں بھکاری عنقا ہی تو ہیں کہ جناب ایڈیٹر صاحب مدظلہ العالی نے ان کی تصویر چھاپ کر شیر مار لیا۔ بھکاری ـــــ بھکاری تو ہندستان کی خاص پیداوار ہے۔ جیسے مکئی، جوار، باجرا، چاول، ہاتھی، سونا، چاندی، چرخہ، گڑھا، کوئلہ، لوہا، ابرک، کلرک، لیڈر، مزدور، فلم ایکٹرس، فلمی رسالے، وغیرہ ویسے ہی تو بھکاری بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ بلکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اگر دنیا کا $\frac{1}{2}$ لوہا اور $\frac{9}{10}$ کوئلہ پیدا ہوتا ہو تو $\frac{99}{100}$ بھکاری بھی۔ پھر کیا کمال ہو گیا کہ سرِ ورق پر دو بھکاریوں کی تصویر چھاپ دی گئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی ایکٹرس بے چارے ایڈیٹر صاحب کو "To the Editor Nizam, With the best Compliment of ---------" لکھ کر اپنی تصویر ہی نہ بھیجتی ہوگی۔ خیر سے ـــــ دوسرے سرِ ورق پر نرگس کی تصویر تھی۔ لیکن کیا خاک؟ کوئی خاص بات نہیں نہ تو سینے کے اُبھار کی نمائش نہ لبوں پر مسکراہٹ اور نہ ہی تصویر کے نیچے کوئی شعر آخر اسی نرگس کی تصویر دوسرے رسالوں میں بھی تو چھپ چکی ہے۔ کتنے اچھے طریقے سے، انوکھے ڈھنگ سے۔

وہ جلدی جلدی ورق اُلٹنے لگا۔ اندر وہی مہمل بکواس جس سے اُسے سخت نفرت تھی ـــــ کیا ہے جناب؟ تو ـــــ "یہ کشمیر ہے" اور اُس نے سوچا کہ اب آگے لکھا رہے گا ـــــ یہ کشمیر ہے، اب آپ کشمیری میں خبریں سُنیں گے۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے ہیں تمام کشمیر پر سُرخ شفق چھا جانے کو ہے۔ چنار کے لال لال درخت ........

"اُف" وہ پھر اپنے آپ پر ہنسا "میرا دماغ خراب ہو جائیگا کیا؟" اور پھر ورق اُلٹنے لگا۔ اُس نے سر ہی تو پیٹ لیا "کیا کاغذ کی بربادی۔"

کیسی واہیات چیزیں ہیں —— "پاکستان اور ہندستان کا منظر" —— کیا بچوں کی سی بات ہے۔ پاکستان اور ہندستان کا منظر دکھانے کے لئے ابھی تک اُن کو اتنا بڑا آرٹکل لکھنا ہی پڑا — بس اتنی سی تو حقیقت ہے کہ پاکستان بھی بن گیا، ہندستان بھی اور اِن دونوں کے مجموعہ سے وہ اپنا پہلا ہندستان "پاکھنڈستان" بن گیا۔ اتنی آسان بات کے لئے اتنا بڑا آرٹکل؟ —— لے دے کر اگر کوئی چیز ملی تو "رنگ ترنگ"، وہ بھی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ آخر دوسرے رسالوں کے بھی تو مزاحیہ کالم ہوتے ہیں —— نینا ایک انگیہ ہے جو بار بار دُھلنے پر بھی نہ پھٹے —— بیگم پارہ ایک گیند ہے جو ہوا بغیر اچھل سکتی ہے —— شمیم کیا ہے —— تسیم کیا ہے؟ وغیرہ ——"

"اچھا صاحب آگے چلئے —— تو بحث و تنقید" چھوڑئے بھی —— تو کیا ہے؟ —— "نظام فن کاروں کی نظر میں" بھئی واہ جیسا آپ کا فن، ویسے آپ کے فن کار، اور ویسی ہی اُن کی نظر —— بے سر پاؤں کے افسانے، اور نثری نظمیں، کھانا کھانے کے بعد پڑھو اور اُلٹی نہ ہو جائے تو جو سزا لیڈر کی، ارے توبہ جو سزا چور کی سو میری، لاش، خون، پیپ، واہ ری شاعری —— جیسے میدانِ جنگ ہی تو ہے۔ بندوق، گولی، یا نہیں تو پھر فقیروں کی ٹولی —— بھوک، افلاس، تباہی —— نہیں تو پھر پنڈال —— مزدور، کسان، انقلاب اور لال لال جھنڈا —— نہ حُسن نہ عشق، نہ پتلی کمر، نہ ہجر کی راتیں، نہ وصال کی آدھی رات —— کیا شاعری ہو گئی —— خوب خوب"

یکایک اُسے نظام کی تاریخ نظر آگئی ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء، اور اس کا جی چاہا کہ زور سے نعرہ لگائے شوکت تھانوی زندہ باد —— دنیا کا سب سے بڑا نجومی زندہ باد —— لیکن پھر اُس نے سوچا ذرا ریکٹ پر کا مہر تو دیکھوں —— ۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء تو گویا ۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو وہ پرچہ بمبئی سے روانہ ہو چکا ہے۔ اور آج ۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ملتا ہے۔ حالانکہ اب نظام ہجرت کر کے پاکستان بھی جا چکا ہے اُسے محکمۂ ڈاک پر ہنسی آنے لگی، پھر اُس نے سوچا جانے دو، سوویشی ہی ڈاک تو ٹھہری۔ اور اُس نے پرچہ کو بند کر کے میز پر رکھ دیا آخر پڑھتا ہی کیا؟ اُس نے صرف اُس کی تباہی کی مدت حساب لگا کر نکال لی —— ایک سال، نو مہینے، دو روز، "چلو کبھی بھی ملتا مجھے اِس سے غرض ہی کیا ہے۔"

کمرہ بالکل تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے سگرٹ سلگا یا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ کھڑکی کھول لے۔ مگر ہمّت نہ ہو رہی تھی اُس نے سوچا تھا کہ بس ایک ہی دفعہ شام کے وقت کمرے سے باہر نکلے گا۔ گویہ بات بھی بھائی جان کے کرفیو کی خلاف حکمی تھی۔ مگر وہ للتا سے تھوڑا ہی ملے گا؟ لیکن سردست تو کھڑکی کھولنا مصیبت تھی۔ شاید وہ باہر ٹہل رہی ہو۔ اور اگر دروازہ کھولے اور وہ چھت پر ہو جب بھی مصیبت۔ للتا پر بھی پروفیسر صاحب نے کرفیو لگا یا تھا۔ مگر زیادہ سختی نہ تھی۔ اِس لئے عین ممکن تھا کہ دروازہ یا کھڑکی کھولے اور وہ نظر آہی جائے۔

کمرے میں سگرٹ کا دھواں پھیل گیا تھا۔ اور اُس کے دماغ میں جیسے کُہر سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟ وہ غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف بڑھا۔ اور پھر رُک گیا —— "اگر اب کے بھائی جان سُن لیں گے کہ میں نے پھر للتا کو دیکھا جب تو گالیاں ہی کھانی پڑیں گی۔ گولیاں کھا کے تو خیر آدمی کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ چلو ہمیشہ کے ڈر سے نجات ملی۔ مگر بھائی جان کی وہ تلخ تلخ گالیاں —— خدا کی پناہ، اُٹھتے بیٹھتے" اور اُس نے سوچا واقعی عُدول حکمی بہت بڑا گناہ ہے۔ اور وہ کوچ پر گر پڑا۔ سگرٹ کا دھواں عجیب عجیب شکلیں بناتا اور پھر بکھر جاتا —— "ہندو، مسلمان، لیگ، کانگریس، دنگا فساد پھر کچھ بھی نہیں۔ انسان کوئی بھی نہیں۔ اور یہ دھواں بھی نئی نئی شکلیں بنا کر غائب ہو جاتا ہے یہ تو منجمد نہیں ہوتا کاش منجمد ہو سکے" وہ سوچتے سوچتے رُک گیا۔ للتا شاید اپنے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ اُس کی موسیقی بھری آواز کی خفیف سی لہر اُس کے کمرے کے اندر بھی آ رہی تھی۔ وہ اپنا مشہور اور پسندیدہ شعر گا رہی تھی ——

اُٹھو سُرخ سویرا ہوتا ہے ٭ فطرت کا عَلَم لہراتا ہے۔

اُس کا دماغ جیسے بڑی تیزی سے گھومنے لگا —— "دنیا ایک محور پر گھومتی ہے، بچو! محور ایک فرضی کھونٹی ہے" اُسے اسکول میں آج سے بہت دن پہلے، بڑی بڑی مونچھوں والے ماسٹر صاحب نے بتایا تھا۔ اُس کا دماغ بھی تو ایک محور ہی پر گھوم رہا تھا۔ بالکل فرضی کھونٹی پر، بھائی جان نے فرض ہی تو کر لیا تھا کہ وہ للتا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ اُن دونوں کے مذہب جُدا جُدا ہیں اس لئے اگر وہ للتا کو پا نہیں سکا تو اُسے دِق ہو جائے گی۔ اور اسی شک کی بنا پر اُن پر کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا جیسے للتا دِق کا کیڑا ہی تو تھی۔ کھڑکی یا دروازہ کھلا نہیں کہ اُس کے پھیپھڑے کے اندر سمایا وہ کیڑا۔

اب کمرہ بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ اُس نے روشنی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ جگمگا گیا — اور دھواں غائب —— شاید ہندو مسلمان، سب کے سب مر گئے۔ صرف روشنی رہ گئی۔ مگر یہ دھواں غائب کہاں ہو گیا؟ کھڑکیاں اور دروازے بھی تو بند ہیں۔ اُسے خود اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ آخر اُس نے بند کیا ہی کیوں؟ یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ کوئی زور زور سے چلا رہا ہے —— اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی —— اور اُس نے دل میں کہا۔

"خوب چلاؤ اور زور سے چلاؤ جی چاہو تو مائیکروفون پر چلاؤ مگر میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ میں کھڑکی نہیں کھول سکتا اور نہ باہر جا سکتا۔ ایک تو بھائی جان کے حکم کے خلاف —— دوسرے میں خود للتا سے نفرت کرتا ہوں میں اُس کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ بے وقوف لڑکی، کہتی ہے۔ بی، اے کرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی ہول ٹائمر بنے گی، اور مزا تو یہ ہے کہ مجھے بھی دعوت دیتی ہے۔ واہ ری لڑکی جیسے میں گھر سے فالتو ہی تو ہوں۔ یا میرا بھی سر ہی تو پھر گیا ہے۔" اُسے للتا کی بات یاد کر کے اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ کہنے لگی "میرا یہ آخری اور اٹل فیصلہ ہے سنسار کی کوئی شکتی مجھے روک نہیں سکتی۔" پڑھی لکھی ہوتے ہوئے بھی حد سے زیادہ احمق جانور ——

اب بالکل شام ہو گئی تھی۔ بند بند اُس کی طبیعت بہت اُکتا گئی تھی۔ اُس نے گھڑی کو دیکھا۔ ارے تو ابھی چھ ہی تو بجے تھے۔ اُس نے سوچا ابھی تو وہ ضرور ٹہل رہی ہوگی، آسمان پر شفق پھولی ہوگی اور شفق سے اُسے کتنا پیار ہے۔ اُس کی تمام تر نظموں میں شفق کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اور اُس کی ایک نظم "پھولی شفق ہے سہانی" بہت مقبول ہوئی تھی۔

کمرے میں مچھر بھن بھنانے لگے۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کے سب پکار پکار کر کہہ رہے ہوں "کرفیو آرڈر — چوبیس گھنٹے کا کرفیو آرڈر۔" "یا اللہ یہ کرفیو آخر ختم بھی ہوگا؟ اچھا کرتا جو میں ہوسٹل ہی میں چھٹی گزار دیتا۔" اور وہ اپنے آپ کو حد درجہ قابلِ رحم سمجھنے لگا۔ اللہ میاں آج شام بھی نہیں ہوگی کیا؟ اُس نے ایک اور سگرٹ سلگا لیا۔ پھر

"کھٹ کھٹ کھٹ"

کسی نے دروازے پر دستک دی اور وہ چونک گیا۔ "ہیں! پروفیسر صاحب؟" وہ چکر میں آ گیا۔ پروفیسر صاحب اب اُس سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ وہ اُن کی ناک جو کاٹنے کو تھا۔ جیسے وہ اُن کی لڑکی کو نگل ہی تو جاتا۔ مگر یہ کیوں آئے۔ اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا کرفیو ختم ہو گیا؟"

"جی نہیں ——" انھوں نے جواب دیا اور پھر بولے۔ "شہر میں گولی چل گئی ہے، کرفیو لگ گیا ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" وہ گھبرا گیا۔

"طالب علموں، مزدوروں، اور عوام نے مل کر جلوس نکالا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ عوام کے رہنما رہا کر دیئے جائیں۔"

"تو پھر گولی کیوں چلائی؟" وہ اور پریشان ہو گیا۔

"بس چل گئی ـــــ کیونکہ حکومت اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی تھی: اور رہنماؤں کو رہا کرنا مشکل ہوگا" پروفیسر صاحب اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ بولے۔

وہ حیران تھا کہ پھر مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت۔ لیکن وہ یہ پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ اِتنے میں للتا آگئی۔ اُس کا ارادہ ہوا کہ کمرے کے اندر جاکر دروازہ بند کرے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

پروفیسر صاحب بولے ـــــ

"عوام کے بہت سارے آدمی مارے گئے ہیں۔ اور بہت سے زخمی ہیں"

"تو میں کیا کروں؟" اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔ اور للتا اور پروفیسر صاحب "میں کیا کروں"، کو بار بار دہرا کر ہنسنے لگے اور وہ پریشانی کے عالم میں دونوں کو تکتا رہا۔ اتنے میں للتا کے پھاٹک پر ایک کار آکر رُکی۔ وہ یہ کار پہچانتا تھا۔ وہ کار زینت کی تھی۔ اُس سے زینت اور روبی نکلیں اور دونوں دوڑ کر للتا کے پاس آئیں۔ اور اسے کھینچ کر لے بھاگیں۔ تینوں کار میں بیٹھ گئیں اور کار چل دی ـــــ پروفیسر صاحب "میں کیا کروں"، کو بہت حقارت کے ساتھ دُہراتے ہوئے چلے گئے۔

اور وہ یہ سوچ کر تعجب کر رہا تھا کہ "کل تک پروفیسر صاحب، زینت اور روبی کو آوارہ لڑکیاں کہتے تھے۔ کیا مجال جو للتا پروفیسر صاحب کی موجودگی میں اُن سے بات بھی کرے۔ اور پھر للتا پروفیسر صاحب کی موجودگی میں میرے سامنے آگئی؟ یہ سب کچھ کیا ہوگیا آخر پروفیسر صاحب میں ایسی تبدیلی؟ ـــــ کیوں؟" مگر وہ سمجھ نہ سکا۔

اتنے میں آواز آنے لگی ـــــ

"شہر میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگا یا جا رہا ہے۔ شہر میں چوبیس گھنٹے......" مائکروفون کے ذریعے اعلان کیا جا رہا تھا۔ وہ گاڑی جس میں مائیکروفون لگا تھا۔ اعلان کرتی ہوئی آگے چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسری گاڑی سڑک سے گزرتے گزرتے ٹھیک اُس کے بنگلے کے پاس رُکی۔ اور چلّانے لگی ـــــ

"یہ جنگ آپ کی اپنی جنگ ہے ـــــ یہ مطالبہ آپ کا اپنا مطالبہ ہے۔ یہ مظاہرہ آپ کا اپنا مظاہرہ ہے ـــــ امیری اور غریبی کی جنگ، آزادی اور خوش حالی کا مطالبہ، بھوک اور افلاس کا مظاہرہ ـــــ آئیے ہمارا ساتھ دیجئے، یہ ادارہ آپ کا اپنا ادارہ ہے ـــــ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کا ادارہ ـــــ نعرہ لگائیے ـــــ ہم سچی آزادی چاہتے ہیں، ہم نئی زندگی چاہتے ہیں ـــــ نیا ہندوستان کو ہم اور آپ جنم دیں گے ـــــ آئیے ہمارا......"

یہ گاڑی بھی آگے چلی گئی۔

وہ کچھ دیر کوچ پر پڑا رہا۔ پھر بے تابی سے اُٹھا۔ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور پھر تیزی کے ساتھ آگے سڑک پر بڑھنے لگا۔ راستے میں اُس نے دیکھا اُس کے بھائی جان رکشے سے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ـــ

"کہاں چلے شہر میں کرفیو لگ گیا ہے"

مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ گیا۔ اُس کے بھائی جان نے اُسے زور سے پکارا۔ مگر وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اُس کے بھائی جان اُسے دیکھتے رہے۔ آگے قریب ایک فرلانگ　داہنے موڑ پر وہ گاڑی اب تک کھڑی تھی۔ اور آواز آرہی تھی ـــــ

"آئیے ہمارا ساتھ دیجئے ـــــ یہ جنگ..........."

اور انھوں نے دیکھا کہ وہ بڑھا جا رہا تھا۔ بڑھا جا رہا تھا۔ پھر جب وہ گاڑی کے پاس پہنچا تو۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور وہ اس میں آگیا آواز اب تک آرہی تھی۔ ........ یہ ادارہ آپ کا اپنا ادارہ ہے ـــ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کا ادارہ....

ایوب سرور

# لامتناہی سلسلہ

وہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی۔ اُٹھ کر وہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اور دھڑ سے اپنے آپ کو اُس نے صوفے پر گرا دیا۔ گھر میں اکیلا بیٹھنا اُس پر انتہائی گراں گذرتا تھا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اُس کے ابّا صبح اُٹھ کر دفتر چلے جاتے تھے۔ اور روزی اس کی رازدار گوانیز خادمہ باورچی خانے میں کھانا پکانے میں معروف تھی۔ اور پھر یہ جگہ نئی تھی۔ کوئی زیادہ ملنے جلنے والے نہ تھے۔ لے دیکر ایک مسز سردار سے اُس کی ملاقات تھی مگر مسز سردار بیچاری پرانی وضع کی ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ بھلا اُن سے اُسے کیا دلچسپی ہوتی۔ اور اُن کی لڑکیاں تو ذرا سی بات پر شرما کر دوپٹے میں منہ چھپا لیتی تھیں۔ اُسے اپنی سہیلیاں یاد آگئیں۔ وہ اپنی ہر سہیلی کو دو دو تین تین خط لکھ چکی تھی۔ مگر اب تک کسی ایک نے بھی اُسے جواب نہ دیا۔ انھیں جواب دینے کی فرصت ہی کہاں ہوگی۔ جیروانکلسار یہ جو ہات پنٹیوں کے ساتھ یورپین لفٹننٹوں کی بڑی طرح شائق تھی۔ مائرا جسے ہر روز کسی رڑے کے ساتھ کلب میں شراب پینے سے فرصت نہ ملتی تھی۔ اور نوشابہ جو ہر خوش پوش لڑکے کو اس طرح چمٹ جاتی جس طرح خارش کتیا کو۔ اُسے اپنی سہیلیوں سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ بھی تو اُس سے محبت کرتی تھیں مگر طوطا چشم نکلیں کمبخت سب کی سب۔ ذرا وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئی۔ اور وہ اُسے بالکل بھول گئیں لڑکوں کو طول طویل خط لکھنے کے لئے تو اُن کے پاس ہمیشہ وقت ہوتا تھا۔

جھلا کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامنے گل مہر کے درخت لال لال پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور گراموفون پر بینی گوڈمین کا ایک ریکارڈ لگا دیا۔ اسکا سر اور ہاتھ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ اور پھر خود بخود اس کے قدم موسیقی کی گت کے ساتھ آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ کاش اس وقت کوئی اُس کے ساتھ ہوتا۔ اُس کا جی چاہا۔ ریکارڈ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی دروازے کی گھنٹی نے بجکر کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ اُس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"ہلو منیر!"

"ہلو رومی۔ تمھارے ابّا دفتر چلے گئے کیا؟"

"ہاں ڈیڈی تو بڑی دیر ہوئی چلے گئے۔ آؤ بیٹھو نا"

منیر اندر آگیا۔ "رومی میں یہ چند کتابیں تمھارے ابّا کے لئے لایا تھا۔ مگر مجھے آتے آتے دیر ہوگئی۔ لو یہ کتابیں تم رکھ لو۔ میں چلتا ہوں"

"اوں منیر بیٹھو نا" اُس نے لاڈ سے کہا "میرا تو اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرا رہا ہے۔ بس یہاں تو سارا دن گھر میں بیٹھے رہو نہ کہیں جانا نہ آنا۔ مجھے تو یہ جگہ بالکل پسند نہیں"

"اچھا" منیر کو اور کوئی بات کہنے کے لئے نہ مل رہی تھی۔ "تو یہ جگہ آپ کو قطعی ناپسند ہے؟"

"تو یہاں پسند کرنے کے لئے کیا رکھا ہے۔ سیر و تفریح کا کوئی مقام نہیں۔ کسی کلب کا تو سرے سے پتہ ہی نہیں ہے۔ بس دن رات چڑیا کی طرح پنجرے میں بند گھر میں بیٹھے رہو۔ میں نے تو ڈیڈی سے کہا تھا کہ وہ تبادلہ کے لئے رضامندی کا اظہار نہ کریں۔ مگر پھر میں خود ہی خاموش ہوگئی مجھے کیا معلوم تھا کہ ہمیں ایسے جہنم میں بھیج دیا جائیگا۔ ہم جہاں رہتے تھے۔ وہ کیسی اچھی

جگہ تھی۔ ہمارے گھر کے قریب جم خانہ تھا۔ جہاں مہینہ میں ایک مرتبہ ڈانس ضرور ہوتا تھا۔ . . . . .

"اچھا تمہیں ڈانس بھی آتا ہے" منیر نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں مجھے تو دو بار ڈانس میں پرائز بھی ملا ہے۔ اور ڈیڈی نے مجھے سوئمنگ کلب بھی جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کیسی اچھی جگہ تھی۔ اور پھر سمندر میں تیرنا کتنا خوشنما ہوتا ہے۔ منیر تم کبھی سمندر میں تیر کر اس کا مزا دیکھو۔ میرا جی چاہتا ہے چند دنوں کے لئے آنٹی کے ہاں جاؤں۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ ہم وہاں اکٹھے سمندر میں تیرا کریں گے۔

"بھئی مجھے تیرنا ویرنا نہیں آتا۔ میں تو آج تک کسی نالے میں بھی نہیں اترا۔ چہ جائیکہ سمندر۔ اور رومی تم وہاں سوئمنگ کا سٹیوم پہن کر سب کے سامنے پھرتی ہوگی"

"اونہہ تو پھر کیا ہوا۔ منیر تم بڑے اولڈ فیشنڈ ہو۔ بالکل (Orthodox.) ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔ نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ تم نے بیچ میں ٹپک کر سب کچھ بھلا دیا۔" اس نے منہ تھوتھا لیا۔

"ارے بھئی تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔ بس تم تو ذرا سی بات میں روٹھ جاتی ہو۔ تم کہہ رہی تھیں کہ جہاں پہلے ہم لوگ رہتے تھے۔ وہ بڑی اچھی جگہ تھی۔ وہاں جم خانہ تھا۔ سوئمنگ کلب تھا۔ ہاں اور کیا کیا تھا وہاں ؟"

"ہاں جم خانہ تھا۔ سوئمنگ کلب تو بہت دور تھا۔ اور اگر دونوں میں سے کسی ایک جگہ جانے کو جی نہ چاہے تو ایک سے ایک اچھا سینما ہاؤس تھا۔ کیسے اچھے اچھے کھیل آتے تھے۔ میں ہفتہ میں دو تین مرتبہ سینما جایا کرتی تھی۔ منیر تم بھی تو سینما جایا کرتے ہوگے Constent nymph تم نے دیکھا۔ کتنا اچھا پکچر تھا"

"میں تو سینما بہت کم جاتا ہوں رومی۔ اور پھر معلوم نہیں یہ فلم یہاں آیا بھی تھا یا نہیں"

"بڑا شاندار کھیل تھا۔ میں نے دو مرتبہ دیکھا تھا۔ اسی میں ایک کم عمر لڑکی کو ایک شخص سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور بیچاری اس کی محبت میں جان دیدیتی ہے"

"اچھا کتنی عمر تھی اس لڑکی کی"

"اب یہ مجھے کیا معلوم۔ سترہ اٹھارہ سال کی نظر آتی تھی"

"تم بھی تو سترہ اٹھارہ سال کی ہو رومی"

"کیوں یہ یک لخت میری عمر پوچھنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی ؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"کچھ نہیں۔ یونہی میں نے پوچھ لیا۔ اچھا رومی کیا سترہ اٹھارہ سالہ لڑکیاں محبت میں بڑی ثابت قدم ہوتی ہیں"

"سب لڑکیاں محبت میں ثابت قدم ہوتی ہیں" وہ جوش میں آکر برسنے لگی "مگر لڑکے اُف یہ لڑکے ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں"

"تمہیں کیا معلوم لڑکوں کے دل پتھر ہوتے ہیں یا نہیں"

"رہنے دو۔ مجھے سب معلوم ہے" اس نے بڑے انداز سے گردن موڑ کر منیر کو دیکھا۔ اور پھر ہنس پڑی "منیر تم مجھ سے خفا تو نہیں ہوگئے ؟"

"نہیں تو"

"بھئی میرا جی تو گھر بیٹھے بیٹھے بُری طرح گھبرانے لگا ہے۔ یہاں کوئی اچھا سینما ہاؤس نہیں ہے"

"ہے کیوں نہیں۔ لینسڈاؤن بہت اچھا سینما ہے۔ اور بھی دو تین سینما ہیں۔

تو کیا تم نے اب تک یہاں کا کوئی سینما نہیں دیکھا"

"مسز سردار کے ساتھ بھی دو ایک بار ہندوستانی فلم دیکھنے گئی تھی۔ مگر ہندوستانی فلم مجھے بالکل پسند نہیں آتے۔ مجھے پھر یہاں راستے اچھی طرح معلوم نہیں۔ اکیلے کہیں جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر میں اگر اکیلی کہیں جاؤں تو ڈیڈی ناراض ہوتے ہیں"

"اور یہ جو تم کہتی ہو کہ میں یہاں جاتی تھی وہاں جاتی تھی تو کیا......."

"میری سہیلیاں میرے ساتھ ہوتی تھیں" وہ تنک کر بولی،

میں خاموش ہو گیا۔

"اچھا لینسڈاؤن میں پکچر کونسا لگا ہوا ہے۔

"اچھا! پکچر............ یہ تو مجھے نہیں معلوم"

"اونہہ تم تو بس —— اچھا جو بھی پکچر ہو۔ میں آج شام کو وہاں ضرور جاؤں گی۔ چلو منیر تم بھی میرے ساتھ چلو"

"اچھا چلو"

"آج کونسا دن ہے؟

"سنیچر ہے"

"پھر تو سینما میں بہت بھیڑ ہو گی"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے"

"اور جو ٹکٹ نہ ملا تو؟"

"ٹکٹ کیوں نہ ملیگا۔ وقت سے پہلے منگوالیں گے"

"اچھا تو پھر تم جلدی سے دو سیٹس ریزرو کرالو"

"مگر یہاں اتنی بھیڑ نہیں ہوتی"

"بس تم تو یہاں بیٹھے ادھر ادھر کے بہانے کرتے رہو گے۔ اور وہاں ٹکٹ سب ختم ہو جائیں گے۔ ٹھہرو، میں نوکر کو بھیج کر منگوائے لیتی ہوں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کون کافر بہانے کر رہا ہے۔ لو میں ابھی جا کر ٹکٹ لئے لیتا ہوں"

"اوہ منیر تم کتنے اچھے ہو"

"منیر نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

"یہاں شو کتنے بجے شروع ہوتا ہے"

"ساڑھے چھ بجے"

"اچھا ٹائمنگ یہاں بھی وہی ہے۔ تو پھر تم ٹھیک چھ بجے آنا۔ ہم یہاں سے ساتھ ہی چلیں گے"

"جیسا ارشاد ہو"

"Bye Bye darling."

Bye Bye."

منیر چلا گیا۔ تو وہ بھی ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور پلنگ پر نیم دراز ہو کر گنگنانے لگی۔

*By the light of the silvery moon.*
*I would like to swoom.*
*To my hony I will croon.*

کاش وہ منیر کو تھوڑی دیر اور ٹھہرا لیتی۔ اس نے سوچا۔ تو وہ اُسے یہ گا کر سناتی کتنی شاندار ٹیون ہے۔ اور ایلس فی گاتی کتنا اچھا ہے۔ مگر ایلس فی سے زیادہ تو جوڈی گرلینڈ کا گانا اُسے پسند ہے۔ جوڈی گرلینڈ کے نام کے ساتھ ہی اُسے مکی رونی بھی یاد آگیا۔ وہ آپٹرا وسے پروا سا لڑکا۔ جو ہر لڑکی کی محبت میں بُری طرح مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی فلموں کے تمام رومانٹک مناظر اُس کی آنکھوں تلے پھرنے لگے۔ اُسے رومانی فلموں سے عشق تھا۔ فلم دیکھتے ہوئے وہ یہ بالکل بھول جاتی کہ وہ سینما ہال میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اُسے یوں معلوم ہوتا کہ جیسے وہ رومانی فضاؤں میں پرواز کر رہی ہے۔ اور وہ اپنے محبوب کی محبت میں بالکل کھوئی ہوئی ہے۔ مگر اُس کا بے فکرا محبوب جانتا ہی نہیں کہ اُس کے دل کی کیا حالت ہے۔ اور پھر یک لخت جب اُسے معلوم ہوتا ہے۔ تو وہ بیتاب ہو کر اس کی جانب بڑھتا ہے۔ اور اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر ........ لیکن چھی چھی اُسے مکی رونی کی شکل بالکل ناپسند ہے۔ موٹی سی ناک پھولے ہوئے گلے۔ ہاں کیری گرانٹ یا چارلس بائر کتنے *Handsome* ہیں۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اُس کی طبیعت پھر اُکتانے لگی تھی۔ پہاڑ سا دن سر پر کھڑا تھا۔ شام کو منیر کے ساتھ سینما جانے کا وعدہ تو تھا۔ مگر ابھی شام ہونے میں بہت دیر ہے۔ اب کیا وقت ہوگا بھلا؟ اُس کے مڑ کر دیکھنے سے پہلے ہی گھڑی نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجائے۔ افوہ پورے چھ گھنٹے باقی ہیں۔ اُس نے کتابوں کی الماری میں سے رائیڈر ہیگرڈ کی کلیوپیٹرہ نکال کر پڑھنی شروع کی۔ ساحل نیل کی پرفضا اور شاداب فضاؤں میں حُسن و عشق کی آنکھ مچولی۔ اُسے اِس کتاب میں صرف چارمیان کی تند و تیز طبیعت پسند تھی جس کی تندی نے ہرمیش کی زندگی تباہ کر دی۔ ہاں محبت کی چنگاری کو حسد کی ہوا شعلہ بنا دیا کرتی ہے۔ مگر محبت اور حسد کے یہ کھیل تو کلبوں میں روزانہ کھیلے جاتے ہیں۔ اور اب بھی عورتیں اور لڑکیاں حسد میں دیوانی ہو کر کیا کیا کچھ کر گذرتی ہیں۔ اُسے یاد آگیا کہ ایک بار جب نوشابہ کے منگیتر کو جیرو انکلساریہ کی ہاف نیٹوں سے نے کھینچنا شروع کیا تو نوشابہ کو مجبوراً ساری کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور وہ کئی بار اس کے ساتھ جوہو پر نہانے کے لئے بھی گئی۔ اب یہ تو صاف ظاہر ہے کہ سوئمنگ کاسٹیوم میں نیکروں کی بہ نسبت زیادہ کشش ہے۔ مگر پھر بھی نوشابہ کو اُس کے ساتھ ہفتہ بھر کے لئے پنج گنی جانے کی دعوت منظور کرنی پڑی۔

کتاب سے اُس کا جی نہ بہلا۔ اُسے اپنا کلب، جم خانہ، اور سہیلیاں بری طرح یاد آ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر اُن رنگین فضاؤں میں واپس پہونچ جائے۔ مگر اتنی جلدی تو اُس کے ابّا اُسے واپس جانے نہ دیں گے۔ کتاب پھینک کر اُس نے اپنی میز کا وہ خانہ جسے وہ بڑی احتیاط سے مقفّل رکھا کرتی تھی۔ کھول کر تصویروں کا البم نکالا۔ اس البم سے کیسی کیسی یادیں وابستہ تھیں۔ اُس کی زندگی کی تمام رنگینیاں اس البم میں بند تھیں۔ وہ تصویریں دیکھنے لگی۔ یہ انیل کی تصویر ہے۔ کتنا اچھا گاتا تھا۔ اس کے نغموں کو سُن سُن کر وہ بے خود ہو جاتی تھی۔ پہلی بار جب وہ ناریل کے اونچے اونچے درختوں کے نیچے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے تو انیل نہیں معلوم کیا آلاپ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے دلکش منظر سامنے سڑک کی دوسری جانب پھیلا ہوا سمندر افق پر ڈوبتا ہوا سورج اور ناریل کے درختوں کے کانپتے ہوئے سائے۔ ایک جھرجھری لے کر اس نے ورق الٹ دیا۔ اور یہ نعمانی کیسا خوبصورت جوان تھا اور کتنا ہنس مکھ۔ فوج کی وردی اس پر کتنی پھبتی تھی۔ بنالال۔ اُسے ہنسی آگئی وہ نعمانی کو بنالال کہہ کر بلاتی تھی۔ وہ ورق اُلٹتی چلی گئی اور یہ ........ اور یہ ...... یہ کون تھا؟ اونہہ اس کا تو نام ہی وہ بھول گئی خیر وہ اُس کا خط نکال کر اس کا نام معلوم کرے گی

کیسی اچھی چھوٹی سی موٹر تھی اس کی جس میں وہ دونوں بیٹھ کر گھوما کرتے تھے۔ یہ ولیم جانسن کتنا اچھا ڈانس کرتا تھا جب ڈانس کرتے کرتے وہ اُسے آہستہ سے بھینچ لیتا۔ تو اُسے یوں معلوم ہوتا ــــ جیسے وہ یونانی دیوتاؤں کی دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ جہاں رقص وموسیقی اور سرمستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور یہ دشوا متر، یہ تو بیوقوف تھا۔ بس ہر وقت زندگی اور اس کے نصب العین کی باتیں کرتا رہتا تھا جو اس کی سمجھ میں خاک نہ آتی تھیں اور شاید دشوا متر خود بھی زندگی اور اپنے نصب العین سے بھاگ کر اُس کے پاس آیا کرتا تھا۔

البم بند کرکے وہ سوچنے لگی کہ ان میں سے کسی ایک سے اُسے محبت نہ ہوئی تھی۔ یہ سب تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے اُسے پسند آئے۔ مگر پھر خود بخود اُس کے دل سے اُتر گئے۔ اور اسی لئے اُسے یقین تھا۔ کہ اُسے اب تک کسی سے بھی سچّی محبت نہ ہوئی تھی۔ مگر مُنیر ـــــ ؟؟؟ اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ منیر سے اُسے واقعی محبت ہوگئی ہے۔ اُس نے آج تک بگلے بھی رنگ کے دیکھے تھے۔ مُنیر اُن سب سے مختلف تھا۔ اس میں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ وہ کبھی کھُل کر بے باکی سے اُس سے بات بھی نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ اُس کے ابا کی موجودگی میں اُن کے ہاں آتا اور اگر کسی روز اُس کے ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ فوراً واپس چلدیتا۔ ایک بار اُس نے زبردستی اُسے بٹھالیا۔ مگر اُسے تو جیسے چپ سی لگ گئی۔ اُس کی باتوں پر وہ ہاں ہوں کرتا رہا۔ اور آخر اُٹھ کر چلدیا۔ شاید منیر کا یہی انداز تھا جو اس پر چھا گیا۔

اُسے یقین تھا کہ اگر منیر سالہا سال بھی اُس کے ہاں آتا رہا۔ جب بھی وہ اُس کے ابا سے ملکر جانے کے سوا کچھ نہ کریگا۔ تنگ آکر ـــ اُس نے ایک خط منیر کو لکھا۔

اچھے منیر صدا اچھے رہو۔

اس خط کو دیکھکر تم میرے متعلق نہ جانے کیا رائے قائم کروگے! اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ایک لڑکی کو ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ مگر کیا کروں یہ کمبخت دل نہیں مانتا۔

منیر کیا تم مجھے برا سمجھنے لگوگے!

اس خط کا جواب ضرور دینا۔ اگر تم نے خط کا جواب نہ دیا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے مجھے کیا ہوگیا ہے؟

*No tongue can tell.*
*No eye could see.*
*The wealth of love.*
*I bear for thee.*

خط کو یونہی ناتمام رکھ کر اُس نے منیر کو بھجوا دیا۔ منیر بجائے جواب دینے کے خود ہی اُس سے ملنے کے لئے آیا۔ مگر اب کی بار وہ بجائے ہمیشہ کی طرح سنجیدہ ہونے کے زندہ دلی کے موڈ میں تھا۔ وہ اُس سے پوچھنے لگا۔

"روحی کیا تمھیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟

اور اُس نے جل کر جواب دیا "سورج کے اُجالے میں آنکھیں کھولے بیٹھے ہو۔ اگر جان بوجھ کر یہ کہنا شروع کردو کہ اس وقت رات ہے تو میں تمھیں کیسے یقین دلا سکتی ہوں"

وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا "روحی مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ تم جیسی (Modern sophisticated) لڑکی مجھ کو کس طرح محبت کرسکتی ہے۔ بھلا بتاؤ وہ کون سی چیز مجھ میں ہے جو تمھیں پسند ہے!"

"مجھے نہیں معلوم" اُس نے بھولے پن سے جواب دیا۔

مگر منیر کیسا عجیب لڑکا تھا۔ یا پھر وہ بے وقوف تھا۔ اُس نے کبھی آگے بڑھ کر اُسے چھونے یا چومنے کی جراءت نہ کی بلکہ وہ تو اُسے کبھی کسی جگہ ملنے یا ساتھ چلنے کے لئے بھی نہ کہتا۔ بس گھر ہی میں گھڑی دو گھڑی باتیں کر لینے پر خوش تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی محبت ہے؟ کہ محب و محبوب آزادی سے مل جل نہ سکیں۔ بلکہ یوں کہو کہ ملنا ہی نہ چاہیں۔ کبھی تو اُسے بے چینی معلوم ہونے لگتی کہ شاید منیر اُس سے محبت ہی نہیں کرتا۔ یا پھر شاید وہ محبت کے متعلق کوئی عجیب و غریب نظریہ رکھتا ہے۔ بہرحال آج اُس نے منیر کو سینما جانے پر رضامند کر ہی لیا تھا۔

روزی نے کمرے میں آکر اُسے چونکا دیا "بی بی چلو کھانا تیار ہے"

"اچھا کھانا تیار ہوگیا" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی "روزی دیکھو آج شام کو میں منیر کے ساتھ سینما جا رہی ہوں۔ ڈیڈی کہہ گئے ہیں کہ وہ رات کو دس بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ اوّل تو میں اُن سے پہلے ہی گھر آجاؤں گی۔ اور اگر میں نہ پہونچ سکی۔ تو تم کہدینا کہ میں مسز سردار سے ملنے گئی ہوں اچھا"

روزی ایک شریر سی مسکراہٹ دبا کر بولی "اچھا اچھا اب تم کھانا تو کھالو۔ ابھی تو سینما میں بہت دیر ہے" کھانا کھا کر وہ سوگئی۔ تقریباً چار بجے اُٹھ کر اُس نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ اور پھر آئینہ کے سامنے بیٹھ کر پاؤڈر روج اور لپ سٹک سے حُسن کے جادو کو جگانے لگی۔

سوا پانچ بج گئے تھے۔ آدھے پون گھنٹے میں منیر آجائیگا۔ لیکن نہیں معلوم پکچر کیسا ہوگا؟ اُسے سنجیدہ ڈرامے یا ٹریجڈی سے نفرت تھی۔ خدا کرے کوئی میوزیکل کامیڈی ہو۔ مگر وہ ابھی کچھ اور سوچ ہی نہ پائی تھی کہ روزی نے اندر آکر اُس کے خیالی قلعوں کو ایک ہی بمب شیل سے اڑا دیا۔

"بی بی تمھارے ابا تو آگئے"

"نہیں کیا کہتی ہو روزی ——— ؟؟"

"ہاں بی بی تمھیں بلا رہے ہیں"

"اچھا چلو آتی ہوں"

بادلِ ناخواستہ وہ اُٹھی۔ یوں تو ابا سے اجازت لے کر بھی وہ سینما جا سکتی تھی۔ مگر اُسے ہر چیز کے لئے اجازت لینا ناپسند تھا۔ اور پھر بہت سی باتیں تو ایسی تھیں جس کے لئے ابا شاید کبھی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس لئے اُس نے اُصول بنا رکھا تھا کہ نہ تو ابا سے کسی بات کا پوچھے۔ اور نہ اُنھیں پتہ چلنے دے۔ وہ اجازت اس وقت لیتی تھی۔ جب کوئی اور بات بنائے نہ بن سکے اور اس پر اکثر اُسے غصہ آجاتا۔ کہ ابا کیوں اُس کے معاملات میں دخل دینے کے حقدار ہیں۔ آخر انھیں کیا حق ہے؟ وہ اپنے بھلے بُرے کو خوب سمجھتی ہے۔ جو کچھ اُس کا جی چاہتا ہے۔ وہ کیوں نہ کرے۔ اور اس وقت بھی اُسے خیال آیا کہ یہ ابا کتنے بے اصولی ہیں۔ کہہ گئے تھے رات کو دس بجے آؤنگا۔ اور پانچ بجے ہی آدھمکے۔ وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے ابا نے کہا۔

"آؤ رومی۔ میرے دوست جیک کارلٹن سے ملو"

جیک نے بڑے تپاک سے کھڑے ہو کر اُس سے ہاتھ ملایا۔

"How do you do."

"Please to see you."

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ اُس کے ابا نے کہا "رومی میرا تو آج جلدی آنے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر جیک نے بتایا کہ اُن کے ہاں آج ڈانس ہے۔ اور میں نے سوچا کہ تم جب سے یہاں آئی ہو۔ زیادہ تر گھر میں اکیلی ہی رہتی ہو۔ اس جگہ تو تم یا دلبستگی کا کوئی سامان

(باقی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

شاہین راہی

# رات

اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا سر کے بال اُسے بُرے معلوم ہو رہے تھے۔ دھوپ کی گرمی سے اُس کی دونوں آنکھیں سرخ تھیں اُس کی طبیعت میں جھنجلاہٹ تھی اور وہ بار بار اپنی انگلیوں سے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کر رہا تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اُسے تعجب ہوا اس کی بڑی خالہ آئی ہوئی تھیں۔ بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو نے اُسے بےچین کر دیا تھا۔ اس کی بھوک جاگ اُٹھی وہ ساری تھکن بھول گیا۔ لیکن خالہ جان کو سامنے مسکراتے ہوئے دیکھکر اسے سلام کرنا ہی پڑا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جاکر کپڑے اُتارنے لگا اور حسب معمول تولیا اُٹھا کر نل کے نیچے جا بیٹھا جسم پر پانی گرتے ہی اُسے ایک ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس ہوئی اور اُس نے نہانا شروع کر دیا۔ صابن کا خیال آتے ہی اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو آواز دی کچھ دیر کے بعد وہ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

"صابن لے آئی فاطمہ" اسے حیرت ہوئی "ارے تو چپ ہے" وہ ششدر رہ گیا، دو جوان نگاہیں آپس میں ٹکرائیں جن میں حیرت اور پریشانی کی جھلک تھی دونوں ایک دوسرے کو نہ جانے کن نگاہوں سے دیکھ رہے تھے پانی اُس کے جسم پر گر رہا تھا اور بلقیس اُسے صابن دے رہی تھی۔

"فاطمہ کہاں چلی گئی؟" وہ مسکرا دیا اور بلقیس شرما کے بھاگ گئی، وہ سوچنے لگا۔ "بلقیس جوان ہوگئی؟ کتنی حسین ہے وہ؟ کیا وہ آج بھی میری دوست ہے؟ کیا وہ آج بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے؟ اس کے ذہن میں ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش اُبھرنے لگے۔ "بچپن، دوستی، انوکھی انوکھی باتیں، چھیڑ چھاڑ لڑائی جھگڑا" وہ نہاتا رہا اور سوچتا رہا "اُف! کیسی غضب کی کشش اس کی نگاہوں میں پیدا ہوگئی، وہ اب جوان ہے ——— وہ اپنی خالہ کو ضرور بہت دن تک روکے گا، وہ اُنھیں اتنی جلدی نہیں جانے دیگا"۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی خالہ جا رہی ہیں، بلقیس کتنی بےچین سی ہے! وہ اسے اپنی پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی ہے، خاموش؟ بالکل خاموش ہے، ——— وہ تصویر حیرت بنا ہوا ہے — وہ کہنا چاہتا ہے "بلقیس تم جا رہی ہو؟" وہ بڑبڑایا "تم نہیں جا سکتیں بلقیس، کبھی نہیں جا سکتیں" اور اُس نے پھر سوچا "کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میری دنیا ویران ہو جائے، تم آئی ہی کیوں تھیں؟ چند لمحات کے لئے آئیں اور اب جا رہی ہو، کیا تم اس لئے آئی تھیں کہ بتا سکو کہ تم کتنی حسین ہو! کتنی جوان!" اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے ویرانے میں کوئی آیا ہی نہ تھا۔

شام ہوگئی اور وہ تاج محل کے لئے چلدیا وہ اُس کے قریب ہی تو رہتا تھا، دن بھر کا تھکا ماندہ اختر آفس کے تاریک ماحول سے نکل کر گھر پہونچتا اور پھر کھانے سے فارغ ہو کر تاج، وہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے اپنے گھر سے کتنی دور جاتا ہے، بہت دور، دو تین میل کے فاصلے پر، دن بھر آفس میں کام کرتا ہے۔ پھر شام کو شاہجہانی عمارت کے کسی باغ میں بیٹھ کر اپنے سارے دُکھ درد کو بھول جاتا ہے آج بھی وہ روز کی طرح، لیکن اپنے سینے میں ایک نامعلوم سی دھڑکن کو چھپائے۔ اس عمارت کی طرف چلدیا جہاں کبھی کبھی سناٹے میں شاہجہاں اور ممتاز کے دوملے جلے قہقہے سنائی دیتے ہیں، وہ سوچتا جا رہا تھا اپنی ممتاز کے بارے میں۔ چاندنی رات تھی، ستارے، جیسے شمع کے سامنے بہت سے چھوٹے چھوٹے مٹی کے دئے ٹمٹما رہے ہوں، شاہجہاں کی ٹھہرائی ہوئی قسم چاند کے سائے میں جگمگا رہی تھی سوکھی ہوئی جمنا کی پتلی سی خاموش دھار مشرق کی جانب دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی چنچل لہریں ساحل سے لپٹ کر کب کی سو چکی تھیں، تاج محل کے سامنے والا فوارہ چاندی کے پگھلتے ہوئے تار برسا رہا تھا پانی کی سطح پر پڑے ہوئے کنول مسکرا رہے تھے، ہوا جنتوں کی

سوئی ٹہنیوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ ہری ہری گھاس پر پڑی ہوئی پانی کی بوندیں نکھری ہوئی چاندنی میں موتی کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب سیکڑوں جگنو چمک رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں قہقہہ لگا رہی تھیں، کوئی منچلا گا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ چاہتا تھا کہ رات بھر وہ ان لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتا رہے۔ رات بھر ان کی باتیں اور قہقہے اس کے کانوں میں گونجتے رہیں۔ وہ بڑے غور سے ان کی باتوں کو سنتا تھا، بچوں نے شور مچایا وہ جھلا گیا۔ پھر — پھر ——— وہ لڑکیاں چلی گئیں اور وہ دیکھتا رہا۔ وہ آج اپنے چاروں طرف عورتوں ہی عورتوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر جاتے ہوئے مرد کو وہ ایک جوان لڑکی کے روپ میں دیکھتا، لیکن حقیقت سے آشنا ہوتے ہی اسے بڑی کوفت ہوتی۔ اس کے ارد گرد چاروں طرف عورت اور مرد گھوم رہے تھے۔ جب کوئی خوبصورت لڑکی کسی جوان لڑکے کے ساتھ ہنستی ہوئی نکلتی تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور اسے محسوس ہوتا، ایک درد، میٹھا میٹھا، بالکل دل کے قریب۔ بنچوں پر بیٹھے ہوئے شہر کے کچھ لڑکے لڑکیوں کو گذرتے پر سرد آہیں بھرنے لگتے۔ کوئی گیت گاتا، کوئی فقرے کستا۔ اور کوئی سیٹی بجانے میں محو ہو جاتا۔ لیکن لڑکیاں، اپنے ساتھیوں کے ہاتھ تھامے ہوئے گذر جاتیں اور لڑکے دل تھام کے بیٹھ جاتے۔ اختر گھومتا ہوا جمنا کی طرف نکل گیا۔ ہر طرف خاموشی مسلط تھی۔ وہ یکایک چونک پڑا، سنگ مرمر کی سفید بنچ پر دو جوان ہستیاں بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھیں، ایک عورت اور دوسرا مرد۔

وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کے سینے میں بےچینی کروٹیں بدلنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے کانوں میں عورت کے درد بھرے گیت کی سہانی آواز گونج اٹھی۔ قریب بیٹھے ہوئے ساتھی نے اسے گدگدایا۔ آواز بکھر گئی۔ گیت گم ہو گیا۔ قہقہوں کی کپکپاہٹ سے فضا تھرتھرا اٹھی اور اختر کے دل کو ایک زبردست ٹھیس لگی۔ اس کے ساتھی نے اصرار کیا۔ وہ پھر گا اٹھی۔ اختر پھر کھو گیا اپنی دنیا میں۔ اس درد بھرے گیت نے اس کی دنیا میں سوز پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ سوچنے لگا۔

"کاش میرے قریب بیٹھ کر بھی کوئی گیت گائے۔ اسی جگہ جمنا کے کنارے، وہ رات بھر گیت سنتا رہے"

عورت پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے سوچا اب وہ خود جا کر اس سے گیت گانے کو کہے وہ جاتے جاتے رک گیا "پاگل! کیا وہ تیرے کہنے پر گیت گا سکیگی؟ کیا اس کا ساتھی یہ دیکھ سکیگا کہ وہ اس کے کہنے پر گیت گائے؟ کیوں نہیں دیکھ سکیگا وہ ——؟"

اختر بےچین ہو گیا، وہ دونوں اٹھ کر جا رہے تھے، وہ چلے گئے اور وہ اسی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اب بالکل خاموشی تھی، نہ کوئی گیت گا رہا تھا نہ کسی ساتھی نے کسی کو گدگدایا۔ کوئل کی دلسوز کوک نے اس کے دل کو پھر سے ہلا دیا۔ وہ تڑپ اٹھا اس کی نگاہوں میں سیکڑوں جوان اور خوبصورت لڑکیاں مسکرانے لگیں، ہزاروں کوئلوں کی کوک اس کے کانوں میں گونج اٹھی۔ اسے پھر بلقیس کا خیال آ گیا اور کتنے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے "وہ بلقیس کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ بلقیس صرف اس کی ہے کس قدر حسین ہے وہ! اس کی نگاہیں بھی تو محبت کا ثبوت دے رہی تھیں۔ وہ اس سے شادی کریگا۔ لیکن۔ کیا شادی ہو سکیگی؟ کیوں نہیں ہو سکتی؟۔ وہ ضرور شادی کریگا۔ اس کی نگاہوں میں بلقیس کی تصویر کانپ اٹھی۔ اس کے بشرے پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ نے اسے بےچین کر دیا۔ اس کی بدمست نگاہوں کو دیکھ کر وہ بیقرار ہو گیا۔ وہ بھی مسکرایا۔ شاہجہاں کی خوبصورت بلڈنگ کو دیکھ کر اس کے سینہ میں ہوک سی اٹھی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ممتاز بیمار پڑی ہوئی ہے۔ شاہجہاں اس پر جھکا ہوا ہے "تم نے ہمیں یاد کیا تھا ملکہ" شاہجہاں نے دریافت کیا۔

"ہاں عالیجاہ!" ممتاز بولی۔ اور کچھ دیر کے لئے پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، بادشاہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے، وہ پریشان ہو گیا۔ بیحد پریشان۔ اس کی دنیا میں قیامت آنے والی تھی۔ اور اس کی خوبصورت ملکہ آنکھیں بند کئے ہوئے بستر مرگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور شاہجہاں اسے متحیر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ملکہ نے آنکھیں کھولیں، بادشاہ مسکرایا۔

"ملکہ! تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی"

"کنیز کو اب زندگی کی خواہش نہیں عالیجاہ!۔۔۔ لیکن میں صرف اتنا چاہتی ہوں ۔۔۔۔۔" ملکہ کا دل بھر آیا اور

آنکھیں چھلک اٹھیں اور بادشاہ بےچین ہوگیا۔

"تم کیا چاہتی ہو ملکہ، قسم ہے رب العزت کی" اور اختر کی نگاہوں میں دو دھندلی سی تصویریں کھنچ گئیں۔ شاہجہاں اور ممتاز اس کے سامنے کھڑے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ شاہجہانی عمارت پر چاند اپنی پوری روشنی ڈال رہا تھا۔ اس نے سوچا وہ بھی بلقیس سے محبت کرتا ہے۔ شاہجہاں کو بھی اپنی بلقیس سے محبت تھی۔ کیا بلقیس بھی اس سے محبت کرتی ہے؟۔ ہوسکتا ہے، اسے اپنا بچپن ضرور یاد ہوگا، تو کیا بچپن کی یاد محبت ہوسکتی ہے؟ کیوں نہیں؟ وہ دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے، ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ آج وہ شرماتی ہے" پھر وہ جیسے سوتے سوتے جاگ پڑا ہو۔ ماضی کی یاد نے اس کے دل میں کروٹ بدلی تھی "نہیں نہیں؟ شاید یہ گیت بھی ادھورا ہی رہ جائے" وہ کانپ اٹھا، اس کے سینے سے دکھ درد کا طوفان امنڈ پڑا۔ اور لاشعوری طریقے سے اس کے ذہن میں گذشتہ واقعات کی تصویر کھنچ گئی۔ "وہ طالب علم تھا، اپنے اسکول کا ایک مشہور طالب علم، ایک مشہور آرٹسٹ، اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہ غم جاناں سے بہت دور تھا! غم دوراں سے قطعاً نابلد، اس کی دنیا میں خوشی تھی، کتابیں تھیں، اسکول کے ساتھی تھے، آزادی تھی، اس کی دنیا میں سب کچھ تھا ——— ایک دن اس نے اپنے قریب انقلاب کی آہٹ سنی وہ سہم گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ نگاہوں سے ڈر گیا تھا۔ وہ نگاہیں تو ایک عجیب کشش لئے ہوئے تھیں، ان میں پریم تھا، رنگینی تھی وہ شوخ نگاہیں! کیا وہ بھول سکتا ہے انھیں؟ وہ تو اسے ہمیشہ یاد رہیں گی! پھر ——— پھر وہ ڈرا کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دوست سے تعلقات نہ بگڑ جائیں۔

وہ اس دن چپ چاپ چلا آیا تھا، پھر وہ روز وہاں جانے لگا۔ کتنا رنگین انقلاب آیا تھا اس کی دنیا میں؟ دو جوان نگاہوں کے تیر اس کے سینہ میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہ روز اس سے ملنے جاتا، کبھی رات کے ظلمت کدہ میں اور کبھی چاند کے نکھرے ہوئے سائے میں۔ وہ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے۔ آج بھی اس کی دنیا میں وہی خوشی تھی، وہی مسکراہٹیں، وہی قہقہے، صرف رنگینی اور محبت کا اضافہ ہوگیا تھا، اف!۔ یہ دور بھی ختم ہوگیا تھا، وہ بیچاری چہار دیواری میں بند کردی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی دنیا والے انھیں ملنے سے نہ روک سکے، وہ راتیں گئے جب سنسار نیند کے آغوش میں پہونچ جاتا تھا، گھر کی پچھلی کھڑکی پر ملتے، وہ روز اپنی دوست کو ایک نئی تصویر بناکے دیتا۔ اور وہ تصویر اس کی محبوبہ تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کا بھائی کیا جانے کہ وہ اسے کیوں تصویر دیتا ہے وہ کھڑکی پر ملتے رہے، اور دن گذرتے رہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کے اندر ڈال دیتا تھا، لیکن دونوں اتنے قریب ہوتے بھی ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ جیسے کوئی قیدی اپنے باہر کھڑے ہوئے ساتھی سے ملتا ہے۔ ان کے درمیان موٹی موٹی سلاخوں کی آہنی دیوار تھی۔ مذہب کی فولادی دیوار انھیں روکے ہوئے تھی۔ مذہب ایک پگڈنڈی ہی تو ہے وہ مٹائی بھی تو جاسکتی ہے اور وہ سوچتے رہے۔

اپنی پگڈنڈیوں کو مٹا کر ایک کر دینے کے بارے میں ان کے حوصلے بلند تھے، ان کے ارادے جوان تھے۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک دن ان کی زندگیوں کو آفات کے ہاتھوں تڑپنا ہے۔ غم و اندوہ کی گھٹائیں بھی ان کی دنیا میں آئیں گی، یاس و حرماں کی بجلیاں بھی ٹوٹیں گی، رنج و الم کا طوفان بھی آئیگا۔ دکھ درد کی آندھیاں بھی چلیں گی، ان کی یہ خوشی مٹ جائیگی، فنا ہوجائیگی اس دنیا کی ہر چیز فنا ہوجاتی ہے۔ اس بدلتی ہوئی دنیا میں لمحہ لمحہ، قدم قدم پر تغیر رونما ہوتا ہے۔ اس کی دنیا نے بھی کروٹ بدلی اور اس کی ماں دھاچلی گئی، کسی گاؤں کو، جہاں سے اس کی شادی ہونا تھی"

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، اسے اپنے کسی دوست کے چند فقرے یاد آئے "پردیسی سے پریت کرنا تو ہمارے دیش کی پرانی ریت ہے اور اس کے چلے جانے پر آنسو بہانا ہماری رسم ٹھہری" وہ بےچین ہوگیا اور اس کا ذہن پھر تصورات کے طوفانی تھپیڑوں سے جاٹکرایا "وہ رات، جب وہ اس سے ملنے گاؤں گیا تھا، کتنی خوفناک رات تھی۔ بالکل اندھیری

پہاڑی کے دامن میں جہاں وہ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا، ایک چھوٹا سا مندر تھا جس میں ایک چھوٹا سا گھی کا دیا ٹمٹما رہا تھا وہ کچھ دن سے روزانہ رات کو اسی مندر میں ملتے تھے۔ پہلے وہ اپنے بھگوان کو پرنام کرتی اور وہ اپنے خدا سے باتیں کرتا۔ پھر دونوں بھگوان اور خدا کے دامن کو پکڑ کر اس دنیا سے ٹکرانے کی قسمیں کھاتے اور پھر ان کی باتیں ہوتیں، میٹھی میٹھی اور رنگین باتیں۔ کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی اور کبھی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگتے۔ اس دن بھی اندھیری رات میں وہ اس کا انتظار کر رہا تھا، لیکن اس دن وہ پریشان تھا۔ بےچین سا تھا، اس کی دنیا سے خوشی روٹھ گئی تھی اور وہ مندر کی دیوار سے ٹکا ہوا خاموش کھڑا تھا۔ رات کے سناٹے میں اسے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پکارا "تم آگئیں رادھا؟"

اس کے کانوں میں ایک کپکپاتی سی آواز آئی "اختر"

دونوں چیخکر ایک دوسرے سے لپٹ گئے، دو خوفناک اور پر درد چیخوں کی فضا میں گونجتے ہی اس سنسان اور خاموش وادی میں ایک سوز چھا گیا تھا، جیسے ساری دنیا میں قیامت آگئی ہو، آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر آگئے ہوں، زمین نیچے دھنس گئی ہو اور کائنات لرز کے رہ گئی ہو، چاروں طرف آگ کے دہکتے ہوئے شعلے برس رہے ہوں۔ چاروں سمتوں میں آگ ہی آگ نظر آ رہی ہو۔ ان چیخوں کے بلند ہوتے ہی آنکھیں برس پڑی تھیں، بہت دیر تک دونوں خاموش کھڑے رہے تھے، لیکن مندر کے دالان میں پتھر کے بھگوان کھڑے ہوئے اسی طرح خاموشی سے مسکراتے رہے، آسمان میں ایک جنبش بھی نہ ہوئی۔

وقت گذر جاتا ہے اور انسان کی پچھلی غلطیاں اسے پریشان کرتی ہیں، اختر بھی جھنجھلایا "اس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ اس اندھیری رات کو اگر وہ چاہتا تو دو تباہ ہوتی ہوئی زندگیوں کو بچا سکتا تھا، لیکن وہ تو خدا کے سہارے بیٹھا تھا، اس سے زندگی میں ایک بھول ہوگئی، ایک زبردست بھول، جس طرح اس نے بعد کو بغاوت کی کوشش کی، ناکامیاب ہوگیا۔ کیسے ہوسکتا تھا کامیاب؟ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ کتنا اچھا تھا کہ اگر وہ پہلے سے ہی بغاوت کرتا۔ وہ جیل میں بھی تو رہا۔ اسے بھوکا بھی تو رہنا پڑا تھا، اس کے پیروں میں کسی نے اپنی ٹوپی بھی تو ڈالی تھی، کسی نے اس سے اپنے خاندان کی بھیک بھی تو مانگی تھی، مگر اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ وہ پاگل تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے خود کے ساتھ اور بھی کئی زندگیوں کو تباہی کے راستہ پر ڈھکیل دیا۔ اس نے اپنی دنیا کو خود برباد کر ڈالا، اس کا گیت نامکمل رہ گیا۔ وہ سوچ نہیں سکا، خدا کی یاد اسے سوچنے ہی کہاں دیتی تھی۔ پھر —— —— پھر وہ کتنے خوفناک راستے پر چل پڑا۔ شراب اور عیاشی، اس کی ناکامی کا ردعمل تھا، اس نے خود کو برباد کر دیا، خاندان والے اس سے ناراض ہوگئے، دوست اور احباب اس سے کنارہ کر گئے۔ وہ بدنام ہوگیا اس کی دنیا میں شراب اور عیاشی کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اس نے کتنی جوان لڑکیوں کو فریب دیا، وہ، وہ کنول —— پاگل لڑکی اس کی خواہشات کا شکار ہوگئی اور وہ اسے بھول بھی گیا۔ کتنے دعوے کئے تھے اس نے، جھوٹے وعدے، کتنی محبت سے ملتا تھا اس سے، لیکن وہ غریب نہ سمجھ سکی کہ اس دھوکے کی دنیا میں ہر قدم پر دھوکے اور فریب سے دوچار ہونا پڑتا ہے"

وہ چونک پڑا آ آ آ کی بھرائی ہوئی آواز ممتاز کے مقبرے میں گونج رہی تھی وہ مسکرایا یہ خادم بھی تو مسافروں کو دھوکا دیتے ہیں، بھولے بھالے انجان مسافروں کو۔ بیچارہ آتا ہے، ممتاز اور شاہجہاں کے مقبرہ کو دیکھنے کے لئے۔ خادم آ آ آ کرتے ہیں، آواز گونجتی ہے اور اس میں ایک انوکھا پن سا پیدا ہو جاتا ہے۔ مسافر چونکتا ہے، خادم مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا ہے "کچھ دے جا بابا" اور مسافر فریب میں پھنس جاتا ہے۔ صرف اسی طرح نہیں اور بھی کئی طرح سے فریب دیا جاتا ہے۔ خادم شاہجہانی عمارت میں آنیوالے کو فریب دیتے ہیں اور خادم ہی کیا، اور دنیا میں ہے ہی کیا؟ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ اس نے بھی تو کتنی لڑکیوں کو فریب دیا ہے، مالتی، نلنی، گنیاں، شہزادی۔ اب تو اس کی زندگی کا ہر ورق سیاہ نظر آتا ہے۔ وہ بھی تو کتنا بہت بڑا فریبی ہے۔ لاکھوں کو اس نے بھی محبت کے فریب دیئے ہیں، جمیلہ؟ رحم آتا ہے بیچاری پر، اس کی نگاہوں میں کتنی

دہی کشش تھی۔ اس کے انداز اس کی محبت۔ وہ کتنی بھولی تھی۔ اس کی کتنی امیدیں وابستہ تھیں اس سے۔ لیکن اس نے، اسے بھی فریب دیا وہ غریب بھی دھوکے میں آ گئی۔ اسے بھی اس نے زندگی بھر دکھی بنا دیا، وہ بھی عمر بھر روئیگی، وہ کہیلی مرد فریبی ہوتا ہے، مرد کہتا ہے عورت دھوکے کا مجسمہ ہے۔ لیکن دونوں پھر بھی دھوکا کھاتے ہیں کیسا تضاد ہے یہ؟۔ کتنے رومان وابستہ ہیں اس کی زندگی سے۔ لیکن ہر گیت ادھورا ہے ———— بلقیس؟۔ تو کیا وہ اسے بھی فریب دینا چاہتا ہے۔ نہیں نہیں وہ اس سے محبت کرتا ہے، لیکن محبت خود ایک فریب ہے۔ کون کہتا ہے محبت فریب ہے؟۔ وہ بلقیس سے شادی کریگا۔ لیکن۔ کل وہ کسی دوسری لڑکی کو دیکھ کر اسے بھی بھول گیا تو؟ ———— اس طرح، کہیں وہ اس کی زندگی بھی تباہ نہ کر دے، مگر ———— ویسا ہوا کیوں؟ اس لئے کہ اس کی دنیا ویران پڑی ہے، اس کے ویرانے میں کوئی بھی ہمک نہیں آیا، ویسے تو سیکڑوں آئے اور چلے بھی گئے، لیکن اسے سکون کہاں ملا، وہ اب سادھا کو تو پا نہیں سکتا، کیوں؟ ———— مجبوری ———— جدھر دیکھو ادھر مجبوری۔ انسان مجبوری سے کبھی نہیں چھوٹ سکتا، مجبوری پھر مجبوری ہے، ناکامی بھی مجبوری پر مبنی ہے اور کامیابی بھی، تباہی اور بربادی کی بنیاد بھی مجبوری ہی پر ہے۔ خوشی بھی کسی چیز سے مجبور ہونے پر ہوتی ہے اور غم بھی مجبوری کا ہی سہارا لئے ہوئے ہے۔

دنیا مجبور ہے، مجبور خود مجبور، مجبور؟ کون ہے جو مجبور نہیں؟ مجبوری کبھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی ———— پھر وہ زندگی کو تباہ کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے۔ کیوں نہیں وہ اپنی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی دنیا کو ایک نئی بنیاد پر تعمیر کر سکتا ہے، زندہ رہنا بہت مشکل ہے، وہ اب اپنی زندگی سے پیار کریگا۔ وہ اب اسے کبھی تباہ نہ ہونے دیگا۔ اسے اپنی والدہ سے کہدینا چاہئے کہ وہ اس کی کہیں بھی شادی کر دیں، کسی جگہ۔ جہاں وہ چاہیں، جس سے کہ وہ اپنے غم کو بھلا سکے۔ وہ ابھی تک شادی سے انکار کرتا رہا، لیکن اب وہ شادی کریگا۔ جس سے کہ اس کے ویرانے میں تام کو ہی بہار آ جائے۔ اس کے وحشت کدہ میں، جہاں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں، جہاں رات ہی رات ہے۔ ایک اندھیری اور خوفناک رات، شمع نہ جل سکی تو مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا ہی ٹمٹمائے۔ شاید اس کی دنیا میں پھر سویرا ہو جائے، اس کی دنیا میں ضرور ایک دن صبح ہو گی لیکن

———— غریب سادھا کا کیا ہوگا؟ وہ کیسی ہو گی؟ کون جانے؟ ———— وہ خوش بھی ہے یا نہیں؟ جانی تو کہتا تھا وہ دکھی ہے، وہ بیمار رہتی ہے اس نے اپنے گھر کو ماتم کدہ بنا رکھا ہے، وہ دن رات روتی ہے ———— پاگل ———— وہ بھی تو روتا ہے۔ رونے کا دوسرا نام ہی تو زندگی ہے۔ انسان روتا ہوا آتا ہے، اس لئے کہ شاید اس سے پہلے بھی روتا ہی ہوگا۔ پھر وہ زندگی بھر روتا ہے، موت کو دیکھ کر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد بھی شاید صرف رونا ہی ہوگا ———— کچھ بھی ہو وہ شادی ضرور کریگا۔ اسے یقین ہے کہ اس کے ویرانے میں جیون ساتھی کے آتے ہی، بہار آ جائیگی اور وہ بھول جائیگا ان تمام باتوں کو۔ آج تک اس سے کوئی بات کرنے والا بھی نہیں، وہ تنہائی میں بیٹھکر روتا ہے اسے بھولی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں " اختر کو ایسا معلوم ہوا، جیسے بہت سے بادل گھر آئے ہیں۔ تیرگی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ہوا کے تند جھونکے شائیں شائیں کی خوفناک آواز پیدا کرنے لگے ہیں۔ گھٹائیں امڈ رہی ہیں۔ گھنگھور اور کالی کالی گھٹائیں۔ رات بڑھتی ہی چلی رہی ہے یکایک بجلی کڑکی، وہ سہم گیا۔ بادل کی گرج نے اس کے دل کو ہلا دیا۔ وہ ڈرنے لگا۔ جیسے جیسے سیلاب آ گیا ہو، پانی بڑھتا چلا جا رہا ہے وہ ڈوبنے لگا اور گھبراہٹ میں اس کی چیخ نکل گئی۔ سادھا دور سے اسے پکار رہی ہے ———— پھر۔ پھر اس نے دیکھا اس کا سر سادھا کے زانو پر رکھا ہے، وہ مسکرایا، سادھا کی سریلی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی " اٹھو جی " ۔ اس کا خواب ٹوٹ گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ سامنے بوڑھے پیٹ والا خادم کھڑا ہوا اپنی گول داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا " اپنے گھر جا کر سو رہیئے "

" اچھا بڑے میاں " وہ کہہ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، چاندنی اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی، اس نے پھر پوچھا " کیا بج گیا ہو گا بڑے میاں " اور جواب میں خادم مسکرایا وہ جھنجھلا کر چل پڑا۔ بڈھے خادم نے پیچھے سے ہنستے ہوئے بڑی دھیمی آواز میں کہا " ابھی تو بہت رات باقی ہے بیٹا "

مظہر علوی

# ردِ عمل

اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر مینڈک کی طرح پھدک رہی تھیں، کبھی اِدھر کبھی اُدھر آفس کے تمام کلرک سر جھکائے کام میں مشغول تھے۔ دروازہ کے پاس چپراسی اسٹول پر بیٹھا اپنی پگڑی گود میں رکھے، اونگھ رہا تھا اور ٹائپ رائٹر کی کھٹ، کھٹ، کھٹاک کی آواز سے کبھی کبھی چونک اٹھتا اور اپنی نیند سے بوجھل لال لال آنکھیں کھول کر کمرہ کا جائزہ لیتا اور پھر گردن جھکا کر اونگھنے لگتا۔

سب اپنے کام میں کھوئے ہوئے تھے اور راج کی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر پھدک رہی تھیں اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر "ٹرِ۔ ر۔ ر۔ ر۔ رن" دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی ایک دم سے چیخ اٹھی۔ چپراسی نے بڑبڑا کر اپنی پگڑی سر پر رکھی اور آنکھیں ملتا ہوا زینہ پر چڑھنے لگا، راج کی انگلیاں بدستور پھدکتی رہیں۔

"راج بابو۔ آپ کو بڑے صاب بلا رہے ہیں" چپراسی نے کچھ دیر بعد اس کے پاس آکر کہا۔

"اونہہ! کیا مصیبت ہے" راج نے بیزاری سے فائل پٹک دیا "کچھ کام ہی چین سے نہیں کرنے دیتے" راج نے کھڑے ہو کر زور سے کرسی پیچھے دھکیل دی اور چپراسی جو نیند کا جھونکا لینے میں کامیاب ہوگیا تھا کرسی کی بھونڈی آواز سے چونک اٹھا۔

راج کے بال گہرے کالے تھے اور اس کے چہرے کا رنگ ایسا تھا جیسے بغیر سوڈا کی گہری سیاہی مائل خالص شراب۔ اس کا لمبا تڑنگا قد، یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی پرانا تناور درخت بغاوت پر آمادہ ہوگیا ہو اور اب زمین سے اپنی جڑیں چھڑا کر اس کی چھاتی پر آزادی سے چل پھر رہا ہو ——— وہ پیر پٹکتا ہوا زینہ پر چڑھنے لگا "چر۔ ر۔ چر۔ ر" زینہ اس کے قدموں تلے کراہ رہا تھا۔

صاحب کے کمرہ کے پاس پہونچکر اس نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا "آجاؤ!" کمرے میں سے صاحب کی آواز یوں آئی جیسے کوئی شخص وزنی بوروں تلے دبا بول رہا ہو۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ سامنے ایک موٹا سا شخص سنہری فریم کی نازک سی عینک ناک پر لٹکائے کاغذات پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کا گنجا سر ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے شتر مرغ کا انڈہ احتیاط سے کاغذات پر رکھا ہو۔

"دیکھو راج" صاحب نے اپنا سر اٹھا کر کہا "میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا کہ اپنا کام اچھی طرح کیا کرو۔ لیکن تم سنتے ہی نہیں گویا میں پتھر سے باتیں کر رہا ہوں۔ یہ دیکھو۔ یہ کاپی تم نے ابھی تک پوری نہیں کی؟ --- What is this - ہیں؟ ملازمت کرلی ہے یا پھر......؟" - "میں تو اسے پوری کر دیتا، لیکن کارنج صاحب نے کہا تھا کہ ...."

"کارنج صاحب نے کہا تھا" صاحب نے نقل اتارتے ہوئے کہا "تم ہمیشہ بہانے بناتے رہتے ہو اور کچھ کام کرتے نہیں"

"واقعی کارنج صاحب......."

"گولی مارو کارنج صاحب کو" صاحب نے زور سے میز پر گھونسا رسید کیا "ایک گھنٹے سے کارنج صاحب کارنج صاحب رٹ رہے ہو، اٹھاؤ یہ کاپی اور نصف گھنٹے میں Complete کرلاؤ۔ سمجھے؟"

صاحب کا سر پھر میز پر جھک گیا۔

راج صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اسے اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی معلوم ہوئی اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا حلق سوکھتا جا رہا ہے "آج سوڈا واٹر پیئیں گے" اس نے سوچا ذرا یہ مسودہ مکمل کرلوں پھر صاحب

خود بخود کچھ روپیہ دلوا دیں گے، کہنے کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ صاحب نے کوئی چیز تلاش کرنے کے لئے تمام کاغذات الٹ پلٹ کر رکھ دیئے "اب تمام دن یہیں کھڑے رہو گے؟ بیوقوف" انھیں راج کا وہاں کھڑا رہنا ناگوار گذرا " جاؤ! آدھ گھنٹے میں کاپی کمپلیٹ کر کے لاؤ، نہیں تو تھیں اوور ورک ــــ OVER WORK کرنا ہوگا۔ اور میں بڑے صاحب سے شکایت کر دوں گا رہ اتنگ ــــ میرا مونھ کیا تک رہے ہو۔ جا ــــ ڈ"

وہ پیر پٹکتا ہوا اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ سڑک پر زناٹے سے ایک موٹر گذر گئی۔ پیٹرول کی ہلکی سی بو تمام کمرے میں پھیل گئی۔ راج کو ایسا معلوم ہوا، جیسے تمام آفس پیٹرول کے سمندر میں ڈوبی جارہی ہے اور اسی سمندر کی سطح پر صاحب کا گنجہ سر نئے فٹ بال کی طرح تیر رہا ہے، پھر ایک دم نہ جانے کیسے پٹرول میں آگ لگ گئی اور صاحب کا دماغ جو آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ پگھل پگھل کر ناک کے راستے بہنے لگا "بھن، بھن" کرتی ایک مکھی اس کی آنکھ کے کوئے میں گھس گئی، اور اس نے اپنے خیالات سے چونک کر مسودہ اپنی طرف گھسیٹ لیا اس میں ایک سطر آدھی سی لکھی ہوئی تھی جب کہ صاحب کو معلوم ہوگیا کہ کاپی نامکمل ہے۔ "اوہ! کیا پیاس لگی ہے" اس نے جلدی جلدی اس سطر کو مکمل کیا اور مسودہ ہیڈ کلرک کی میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ہیڈ کلرک بھنگن سے جھگڑ رہا تھا کہ وہ آفس کو کیا ڈھنڈ میں اچھی طرح جھاڑو نہیں دیتی۔ اس نے فائل پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور "ہوں" کہہ کر پھر بھنگن کی طرف متوجہ ہوگیا۔

چھوٹے سے ہوٹل میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور ایک لڑکا میلے چکٹ کپڑے سے میز صاف کر رہا تھا۔

"ایک گلاس پانی لاؤ" راج نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "ٹھنڈا لانا برف کا"

"برف کا؟" لڑکا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا "سردی میں ــــ برف کا ــــ پانی"

"ہاں، ہاں۔ برف کا۔ جلدی لاؤ گلاس بھر کر"

وہ دیوار پر لگا ہوا ویٹو کا اشتہار دیکھنے لگا "سنا ہے ویٹو میں شراب ملی ہوتی ہے" اس نے سوچا "لیکن اس کا مزا تو ہوتا ہی نہیں ہے ــــ مچ ــــ ا ــ ا ــ ا ــ کتنے دن سے بازار کی طرف گیا ہی نہیں۔ آج اگر کچھ روپے مل جائیں تو ایک آدھ ..... کھٹ سے لڑکے نے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ راج نے گلاس اٹھایا اور ویٹو کے اشتہار کی طرف دیکھتے ہوئے مزے لے لیکر ایک ایک گھونٹ پینے لگا، جیسے وہ شراب پی رہا ہو، تازہ انگور کی شراب ــــ "اور لاؤ" ــــ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا ــــ "بڑی اچھی ہے تمھارے یہاں شراب ........ ــــــــ میرا مطلب ہے پانی" اس نے دوسرا گلاس بھی ایک ایک گھونٹ پی کر ختم کیا اور میز پر اکنی پھینکتا ہوا باہر چل دیا۔ لڑکا حیرت سے کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔

"کہاں تھے آپ ابھی تک؟" ہیڈ کلرک نے مرغ کی طرح گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا "مسودہ لیکر جائیے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں" لیکن راج زینے کے پاس کھڑی ہوئی گول مول اینگلو انڈین لڑکی "ریچل" کی طرف دیکھتا رہا جو صاحب سے ملنے کے لئے ہمیشہ آتی رہتی تھی۔ صاحب اس پر بہت مہربان تھے۔ ایک دن ہیڈ کلرک کہہ رہا تھا کہ اسی ریچل کے لئے صاحب اپنی بیوی سے لڑ پڑے اور اس کو اپنے باپ کے گھر بھیج دیا اور اب ریچل کو اپنی کار میں لئے گھوما کرتے ہیں۔

"کچھ بڑی بات نہیں کبھی کبھی ......." ہیڈ کلرک نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن اس لڑکی کو جی بھر کر بعد میں دیکھئے، پہلے صاحب کے پاس ہو آئیے" تمام کلرکوں کے بیچ میں اس طرح ٹوکنے پر وہ جھلا اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے فائل اٹھا کر بغل میں دبا لیا "اونھ یہ بھی کوئی ملازمت ہے! صبح سے شام تک، سر کھپاؤ، جھڑکیاں سنو، اور مذاق سہو سو الگ" اس نے زینہ کی طرف دیکھا ریچل جا چکی تھی "یہ سالا مسودہ مکمل ہونے ہی میں نہیں آتا۔ ابھی اور بہت سے کام ہیں۔ اسی طرح صاحب کے سامنے رکھ دیتا ہوں"

راج مسودہ بغل میں دبائے صاحب کے کمرہ میں گھس گیا۔ صاحب کا انڈے جیسا صاف سر ریچل کے چہرے پر جھکا ہوا تھا اور ان کا ایک پیر ریچل کے پیر پر پڑا جھول رہا تھا، وہ راج کو دیکھتے ہی گھبرا کر الگ ہوگئے "ہاتے تیری کی" راج دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

"صاحب پر معلوم ہوتا ہے آج کچھ رعب پڑا" صاحب نے مسودہ کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی، گویا کہہ رہے ہوں "ٹھیک ہے!"

راج مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھا اور ٹائپ کرنے لگا۔ لیکن اس کا دماغ خیالات کے پروں پر اڑتا ہوا کہیں سے کہیں جا پہونچا اُس کو ایسا دکھائی دیا جیسے ٹائپ رائٹر کرسی میں تبدیل ہوگئی ہے، جس پر ریچل بیٹھی ہوئی ہے اور وہ اُس کے پیر دبا رہا ہے، وہ اچک کر ریچل سے بھڑ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کا سر ریچل کے چہرے پر جھکنے لگا اور جھکتا ہی چلا گیا۔

"اوخہ! اس نے ہورمزجی اینڈ سنز کے بجائے، ہورمزجی اینڈ ہورمزجی ٹائپ کر دیا تھا۔ اس نے ٹائپ رائٹر سے کاغذ گھسیٹ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا، جیسے وہ اپنے مضحکہ خیز خیالات پھینک رہا ہو، ٹوکری میز کے نیچے ڈھکیلنے کے لئے اس نے اس کو لات ماری اور ٹوکری اُلٹ کر تمام کاغذات اُس کے خیالات کی طرح بکھر گئے" کیا مصیبت ہے" گھڑی میں گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ اس نے پانچ بجا دیئے۔ اس نے جلدی جلدی ٹوکری میں کاغذ بھر کر نیچے ڈھکیل دیا۔ "پانچ بج گئے اور ابھی میرے لئے چودہ صفحے لکھنے باقی ہیں۔ افوہ!" اس کو ایسا معلوم ہوا، جیسے دنیا کے تمام سمندروں کا پانی اس کے دل کے اردگرد چکر کاٹ رہا ہے اور اس کا دل ان گہرے گہرے پانیوں کی تہوں میں ڈوبا جا رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ تمام کام چھوڑ کر باہر بھاگ جائے۔ اور آفس کو کس کر ایسی ٹھوکر جمائے کہ وہ مع صاحب کے لڑھکتی ہوئی ان گہرے گہرے پانیوں کی تہوں میں جا پڑے۔

"جی صاحب" وہ صاحب کی تیسری آواز پر خیالات کی دلدل سے بمشکل باہر آیا۔ زینہ کے قریب صاحب ریچل کے ساتھ کھڑے بڑبڑا رہے تھے، راج ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "بہرے ہوگئے ہو کیا؟ ایک گھنٹہ سے چیخ رہا ہوں اور تم جیسے جانتے ہی نہیں" صاحب کا مارے غصّے کے بُرا حال تھا۔ "اور یہ دیکھو تم نے پھر کاپی پوری نہیں کی، آخر اس سے تمہارا مطلب کیا ہے"

"جی میں نے تو دوسری کاپی کی بالکل نقل کی ہے، اس میں میرا کیا قصور" راج نے آہستہ سے کہا

"لیکن یہ آخری سطریں کہاں گئیں؟"

"میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا" راج کا غصّہ کسی دریا کے سیلاب کی طرح بڑھ رہا تھا

"تم کچھ نہیں جانتے؟ یقیناً تم کچھ نہیں جانتے" صاحب نے زمین پر پیر پٹک کر کہا "میں نے یہاں تمہیں جھک مارنے کو رکھا ہے۔ کیوں؟ تم ہمیشہ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔ آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ کیا تم نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے۔ ہیں؟ میں پوچھتا ہوں —— ؟ AM I A FOOL.

"بہتر ہے کہ یہ سوال آپ مجھ سے نہ پوچھیں"

"تمام کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا، کلرکوں کی انگلیاں ٹائپ رائٹر کی کلیوں پر، ایک جگہ پر رک گئی تھیں، وہ سب گردنیں گھمائے ہوئے راج کی طرف دیکھ رہے تھے —— صاحب نے حیرت سے ریچل کی طرف دیکھا وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر مسکرا رہی تھی۔ صاحب بالکل ہی چراغ پا ہوگئے۔ اُنھوں نے اپنی مٹھی مضبوطی سے بند کی اور اس کو راج کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے دھاڑے "کام کرتے موت آتی ہے کیوں؟۔ اور پھر سامنے جواب دیتے ہو، اچھی بات ہے، میں تمہیں ڈسچارج کرتا ہوں، کل یہاں قدم بھی مت رکھنا —— سمجھے" وہ ریچل کو گھسیٹتے ہوئے چلے گئے

★

وہ آفس کے دروازے سے لگا کیشیر کی راہ دیکھ رہا تھا لیکن کیشیر کا کہیں پتہ نہ تھا "نہ جانے کیا کر رہا ہے اندر" اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا، کیشیر چابیوں کا گچھا اچھالتا آ رہا تھا۔

میں نے کہا "...... وہ ..... کچھ ...... روپے دوگے؟ تھوڑے سے ہی" اس نے کیشیر کا ہاتھ پکڑ کر سرگوشی کی۔

"کہاں ہیں روپے وُپے، جب دیکھو جب بھکاریوں کی طرح کچھ نہ کچھ مانگتے ہی رہتے ہو" وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر چل ...... دیا

جی چاہا کہ وہ کیشیئر کی گردن مرغی کی طرح مروڑ کر رکھدے "صاحب سے چل کر معافی مانگوں؟ ہاں ملازمت تو بچی رہیگی" اس نے سوچا "معافی؟ نہیں میں حرامزادے گنجے سے کبھی معافی نہیں مانگوں گا" اس نے آپ ہی چلا کر کہا، جیسے کسی نے اس کے سر پر تپا ہوا تانبہ رکھدیا ہو۔ "تو، تو، پھر روپے کہاں سے لاؤں؟" اس نے گھڑی کی چین پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچا "آخری اکنی۔ بھی ٹھنڈے پانی کے گلاس میں ڈوب گئی" اس کو کچھ خیال آیا۔ اور وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا ایک دکان میں گھس گیا۔

جب وہ دکان سے باہر آیا تو اس کی جیب میں دس دس روپے کے دو نوٹ تھے اور کلائی پر گھڑی کی چین کا نشان۔ وہ کبھی کبھی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کو چھولیتا اور اس کے دماغ میں کوئی خیال پر کٹے پرند کی طرح پھڑ پھڑا کر رہجاتا اور پھر اس کا دماغ آس پاس کے ہوٹلوں سے آتی ہوئی لذیذ کھانوں کی خوشبو سے پُر ہوجاتا۔

"ارے بھئی راج کہاں جارہے ہو دندناتے؟" کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا، راج نے مڑکر دیکھا تو اسلم۔ لڈنی۔ جاڈ اور گوبند کھڑے مسکرا رہے تھے "کہاں؟ آفس سے آرہے ہو؟"

"ہوں!"

"ہیں، بات کیا ہے۔ آخر مونھ کیوں تھوتھائے ہو؟"

"چلو یار، بار میں چل کر باتیں کریں گے"

★

"صاحب بھی یاد ہی کرتا ہوگا" راج نے بوتل ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "مزا چکھا دیا میں نے بھی"

"پھر بھی ہوا کیا؟"

"کچھ نہیں یار، ذرا جھڑپ ہوگئی، صاحب کو میں نے بھی وہ پھڑ پھڑ جواب دیئے ہیں کہ بیچارہ مونھ تکتا رہ گیا۔ ہا۔ ہا۔ ہا!"

"اونھ اس میں تم نے کونسا شیر مارا" لڈنی بول پڑا۔ "ایک دن نہ جانے کس بات پر صاحب نے مجھ کو گالی دی تھی، تو صاحب میں نے بھی وہ گھونسہ جمایا، کہ آج تک وہ مجھ سے دبتا ہے"

راج کو ایسا معلوم ہوا، جیسے لڈنی نے صاحب کو نہیں بلکہ راج کے مونھ پر گھونسا رسید کیا ہے۔ اس نے جھلا کر گردن دوسری طرف موڑلی۔ قریب ہی کی میز پر ایک کرسچین لڑکی ایک گورے چٹے لڑکے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ راج اس کی طرف دیکھنے لگا وہ بھی کبھی کبھی اسکی طرف دیکھ لیتی اور پھر گھبرا کر اپنے ساتھی سے باتیں کرنے لگی۔

نہ جانے وہ کب تک لڑکی کی طرف دیکھتا رہا کہ گوبند نے اسے جھنجھوڑ ڈالا "سن رہے ہو راج۔ اسلم کہتا ہے کہ ہم سب میں زیادہ طاقتور وہی ہے!"

"کون؟ یہ اپنا اسلم۔ ارے یہ تو خواہ مخواہ ڈینگ ہانک رہا ہے!"

"آجاؤ! پھر آزمالو۔ ہم تم پنجہ لڑائیں!"

فوراً میز پر سے بوتلیں وغیرہ ہٹالی گئیں۔ میز پر کپڑا پھیر کر اسے صاف کیا گیا۔ اسلم اور راج نے اپنی اپنی کہنی میز پر ٹکادی اور ایک دوسرے کا پنجہ جکڑ لیا۔ اسلم راج کا اور راج، اسلم کا پنجہ میز کی سطح سے ملانیکی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں کی نسیں پھول کر ابھر آئی تھیں لیکن راج کی پیشانی کی رگیں تک جیسے خون میں تیر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑتی تھیں اور چہرے کا رنگ لال بھبھوکا ہوگیا تھا۔ جیسے تمام بدن کا خون سمٹ کر چہرے میں آگیا ہو۔

"او۔ و۔ و۔ ں" اسلم نے زور لگایا اور راج کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا اور وہ دھپ سے میز پر جا پڑا۔

"ات تیری ایسی کی تیسی، اسی لئے اکڑ رہا تھا۔

"وہ تو میں اتفاقیہ ہار گیا۔ اس میں، اتنا اکڑتے کیوں ہو"

"یہ بات ہے۔ اچھا پھر آجاؤ!"

اس دفعہ بھی راج نے بہت زور مارا۔ لیکن پھر وہی اس کا ہاتھ میز پر جا پڑا۔ "ہٹاؤ یار" راج اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس کا پنجہ توڑ کر رکھدیتا۔ راج کی ناک میں خوشبو کا ایک بھبکا سا آیا اور اس نے اپنے کندھے پر کسی کے نرم نرم ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ راج نے نظر اٹھا کر دیکھا، قریب بیٹھی ہوئی کرسچین لڑکی اپنی ساڑھی سمیٹے راج کی طرف دیکھتی ہوئی اس کے قریب سے گذر رہی تھی۔

"جی فرمایئے!" راج نے آہستہ سے امید بھرے لہجہ میں کہا تاکہ اس کے دوست سن نہ لیں۔

"او، معاف کیجئے شاید آپ کو ٹھوکا لگ گیا" وہ اپنی ساری سمیٹے نکل چلی گئی اور راج کے تمام ساتھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے راج جھینپ سا گیا۔

"ارے ہاں۔ سنا ہے یار جاوید تمھاری ناٹک کمپنی میں دو نئی لڑکیاں آئی ہیں" اسلم کہہ رہا تھا۔

"ہاں۔ آئی تو ہیں۔ کیوں؟"

"ملاقات کراؤ نہ ہماری"

"اچھا یہ بات ہے، کل چلنا میرے ساتھ"

"میں بھی چلوں گا یار، ذرا لطف رہیگا" راج نے کہا۔

"تم ان سے مل کر کیا کروگے، تمھاری جو بیوی ہے نہ بس وہ ہے ہی سنبھال کر بیٹھ رہو" اور قہقہوں سے بار کی دیواریں تک رنگئیں راج کا جی چاہا کہ وہ بار کی تمام بوتلیں ایک ایک کر کے جاوید کے سر پر پھوڑ دے۔

★

وہ پانچوں اسٹینڈ پر کھڑے بس کی راہ دیکھ رہے تھے اور جاوید ان نئی لڑکیوں کی تعریف کئے جا رہا تھا۔ اور سب کے دل مچل رہے تھے کہ کل ہو اور کب لڑکیوں سے ملاقات ہو۔ لیکن راج کھمبے کو پکڑے کھڑا تھا اور لحظہ بہ لحظہ اس کی مٹھی مضبوط ہوتی ہو رہی تھی۔ اس کے قریب تین گجراتی "سوں پچھے۔ ایم پچھے۔ تیم چھے" کی رٹ لگائے اس کا دماغ چاٹ رہے تھے "ارے ملائی ہے ملائی۔ تم دیکھنا تو سہی" جاوید کہہ رہا تھا، اور راج کا جی چاہا کہ کسی قریب کی دکان سے بالائی کا دونہ اٹھا کر جاوید کے منھ پر کھینچ مارے۔

بس پھڑ پھڑاتی اسٹینڈ پر آکھڑی ہوئی تینوں گجراتی اور جاوید اپنی باتوں سے چونک کر بس کی طرف لپکے۔ راج جب لڑکھڑاتے قدموں سے بس تک پہنچا تو اس کے سب ساتھی اور تینوں گجراتی بس میں چڑھ چکے تھے "چلنے دو" کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی۔

"ٹھہرنا بھئی" راج دوڑ کر زینہ پر جا چڑھا۔

"جگہ نہیں ہے" راج کا ایک پیر بس میں تھا اور ایک زینہ پر، اور کنڈکٹر ہاتھ سے راستہ روکے کھڑا تھا۔

"آجانے تو دو یار، میں کھڑا رہوں گا" راج نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

"بالکل جگہ نہیں کھڑے رہنے کی بھی"

"ابے میرے بوجھ سے تیری موٹر کے پہیئے نہیں پچک جائیں گے، ہٹ، جانے دے"

"چلے آنے دو یار" اندر سے گوبند نے کہا۔

"کیسے چلے آنے دو" کنڈکٹر بھی تمام دن کی محنت سے گھبرایا ہوا تھا۔ "ایک وقت کہہ دیا کہ اب اس میں کوئی نہیں بیٹھ سکتا اگر پولیس والے نے نام لکھ لیا تو جرمانہ کون چچا میاں دیں گے" اس نے دھکا دیکر راج کو اتار دیا "چلنے دو!"

راج کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ اگر کہیں کنڈکٹر اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ مارے لاتوں کے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ اس نے قریب پڑے ہوئے پتھر پر زور سے لات جما دی، اس کے انگوٹھے کا ناخن جھنجھنا اٹھا اور پتھر لڑھکتا ہوا، فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک بڈھے شخص کے ٹخنے میں کھٹاک سے جا لگا "بے او!" وہ اپنا پیر سہلانے لگا "تیرا بجک ٹھکانے ہے کہ نہیں؟" راج پیر ٹپکتا پیدل ہی مکان کی طرف چل دیا۔

جب وہ مکان پہونچا تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کی ٹانگوں میں سیسہ بھر دیا ہو اور پیر کا انگوٹھا شدید درد کر رہا تھا اور جیب میں سگریٹ کا ایک پیکٹ پڑا ہوا تھا جس میں دو سگریٹ بے بسی سے ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔

"سب ختم ہو گئے؟ ایک پائی بھی نہیں؟ سالے سبھی مفت میں کھا پی گئے" اس نے زور سے دروازہ کو دھکا دیا جو ایک دھماکے سے کھل گیا۔

مکان میں اندھیرا گھپ تھا۔ "کملا۔ کملا" اس نے اپنی بیوی کو پکارا۔ لیکن اس کو کوئی جواب نہیں ملا۔ "اتنی جلدی سو بھی گئی" وہ بتی جلانے آگے بڑھا، کوئی چیز کھٹاک سے اس کے گھٹنے میں لگی "اوفوہ! کمبخت بتی جلا کر تو سوئی ہوتی" اس نے کرسی اٹھا کر ایک طرف پھینک دی، اور ٹٹول ٹٹول کر بٹن تک پہنچا اور بتی جلا دی۔

کمرہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ "کہاں گئی؟" اس کے دل میں خوفناک خیالات آتے رہے "کہاں گئی اتنی رات گئے؟ اور وہ بھی دروازہ کھلا چھوڑ کر" وہ دھب سے کرسی میں دھنس گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ آج کے تمام واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور پھر "تمہاری جو بیوی ہے بس اسے ہی سنبھال کر بیٹھ رہو" اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی تمام دیواریں قہقہہ لگا کر ہنس پڑی ہوں۔ "اوفوہ! بیوی! لیکن گئی کہاں؟"

"ٹرر، ٹرر" کسی کونے سے جھینگر چلا اٹھا، راج کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو "کل سے تمہاری ملازمت ختم۔ تمہارے دوست روپئے کھا گئے، اور گھڑی بھی گئی، ایک کنڈکٹر نے تمہیں جھڑک دیا اور لڑکیوں سے بھی تم نہیں مل سکتے، کیونکہ تمہاری جو بیوی ہے نا....

........ ٹرر۔ ٹرر۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔" "ارے آپ آگئے؟" راج نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کملا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "کہاں تھیں اب تک؟" راج کی آواز میں گرج تھی۔ "کیوں؟ آج منگل ہے نا؟ کتھا میں گئی تھی" کملا کو راج کے لہجہ پر تعجب ہو رہا تھا۔ "کتھا میں گئی تھی" راج نے منہ بگاڑا "بڑی ہری بھجن کی بچی بنی پھرتی ہے" "آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

"دیوانہ ہو گیا ہوں، تم کتھا میں گئی تھیں تو مکان کا دروازہ کیوں کھلا چھوڑا؟" راج نے پاس پڑا ہوا بید اٹھا لیا۔

"میں نے تو تمہارے خیال سے دروازہ کھلا چھوڑا تھا کہ آئیں گے تو کہاں باہر پڑے رہیں گے"

"میں گیا جہنم میں، بڑا خیال ہے بیچاری کو میرا اگر ایسا ہی میرا خیال ہے تو تم یہاں میرے لئے رکی کیوں نہیں؟ اور اگر جانا ہی تھا تو بند کر کے جانا تھا، اگر کوئی گھس کر صفایا کر جاتا تو......" کملا حیرت سے راج کی طرف تک رہی تھی۔ راج نے اس کے قریب پہونچ کر اپنا ہاتھ بلند کیا "بول، کیوں دروازہ کھلا رکھا....." ساڑ۔ سڑاک۔ ساڑ۔ اس نے کملا پر بید برسانے شروع کئے۔ کملا مارے تکلیف کے زمین پر بیٹھ گئی، لیکن وہ اس پر بید برساتا ہی رہا۔ ساڑ۔ ساڑ۔ سڑاک۔

"ٹرر۔ ٹرر" کسی کونے سے جھینگر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین احمد آباد میں پڑھا گیا)

# ترقی پسند تنقید پر ایک نظر

## فسادی اُدَب پر فساد

## جائزے

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

محمد مثنیٰ رضوی

# ترقی پسند تنقید پر ایک نظر

اردو ادب میں تنقیدی مواد اس قدر کم اور غیر ترقی یافتہ صورت میں تھا کہ اس کے بارے میں کلیم الدین احمد نے جھنجھلا کر یہاں تک لکھ دیا کہ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر"۔ پروفیسر موصوف کے اس جملہ میں تھوڑی سی صداقت ضرور ہے مگر اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقید میں زمانہ، ماحول اور تاریخی شعور کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اردو ادب میں تنقید کی لاکھ کمی سہی لیکن جو تھوڑے بہت شاعروں کے تذکرے ملتے ہیں ان میں تکرار، یکسانیت، تنگ نظری، ذاتی مناقشات، سطحیت، بے ترتیبی بے جا اختصار اور دوسری کمزوریوں کے باوجود ایک خاص قسم کا تنقیدی شعور یقیناً ملتا ہے جو غیر واضح، نامکمل بے ترتیب اور مختصر ضرور ہے مگر اسے معشوق کی موہوم کمر، سے تشبیہ دینا سخت قسم کی ناانصافی اور زیادتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب بذات خود اس قدر محدود تھا کہ اس سے بلند پایہ قسم کی تنقید کا خمیر اٹھنا خلاف فطرت ہوتا جب تک کسی زبان کا ادب زیادہ ترقی یافتہ، فراخ، وسیع اور پھیلا ہوا نہ ہو اس وقت تک اس زبان کی تنقید کیونکر وسیع اور گہری ہو سکتی ہے چنانچہ یہی حال ہمارے اردو ادب کا تھا لہٰذا اس زمانہ میں اچھی تلی، وسیع، وقیع اور گہرے قسم کی تنقید کی امید رکھنا ایک فضول سی بات ہے۔ قدیم اردو ادب میں جو یہ قول ایک نقاد کے اپنے مرثیہ اور دوسروں کے قصیدہ میں بند تھا اگر ہمیں معیاری، بلند پایہ اور وقیع تنقید نہیں ملتی تو اس پر جھنجھلا کر سرے سے اس کے وجود ہی سے انکار کر دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے اسباب پر اچھی طرح غور کر کے تعمیری تنقید کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں شعراء کے تذکروں کو سب سے پہلے ترقی دے کر آزاد نے آب حیات لکھی لیکن معیاری اور اصلی معنوں میں تنقید کی ابتدا اردو ادب میں حالیؔ نے کی۔

حالیؔ ہی سب سے پہلے نقاد تھے جنہوں نے اردو ادب میں تنقید کا واضح اور قطعی تصور پیدا کیا جو ادب کو زندگی کی تنقید سمجھتا ہے اور اسے سماجی، سیاسی اور معاشی پس منظر میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالیؔ نے سب سے پہلے اردو ادب کی دنیا میں شعوری طور پر یہ احساس پیدا کیا کہ ادب اور زندگی میں ایک مضبوط اور ناگزیر ربط ہے۔ اور ادب کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی تحریکات سے متاثر ہو اور ان پر اثر انداز ہو اور اس طرح ہماری اجتماعی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں مددگار ثابت ہو۔ حالیؔ نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے جو کچھ کیا اس کے بار سے اردو ادب کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا لیکن ان کے بعد اردو تنقید مستقل ترقی کرتی رہی اور اب تو ترقی پسند تنقید نے اردو ادب میں تنقید کو وہ منصب عطا کیا ہے کہ وہ بجا طور پر اپنے اوپر فخر کر سکتی ہے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر واضح کر دینے کی ضرورت ہے۔ بعض لوگ نفلی، منطقی، تشریحی، جمالیاتی اور نفسیاتی تنقید کی طرح ترقی پسند تنقید کو بھی تنقید کی ایک شاخ سمجھتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ترقی پسند تنقید اس قدر جامع ہے کہ وہ ان تمام مختلف شاخوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور سب پر حاوی ہو جاتی ہے اس طرح ترقی پسند تنقید ایک مخصوص تصور نہیں بلکہ تنقید کا اصلی، صحیح، واضح، جامع اور آفاقی تصور ہے اور جو ہر جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ چیزوں کو خانوں میں بانٹ کے نہیں دیکھتا بلکہ ہر چیز کو بحیثیت مجموعی پرکھتا ہے۔ ترقی پسند تنقید ادب کو اس کے سماجی، اقتصادی اور معاشی پس منظر میں دیکھتی ہے۔ ایک ایسا نقاد جو ترقی پسند تنقید کا حامل ہے کسی تصنیف یا ادبی شہ پارے کو پرکھتے ہوئے اس کی ذہنی کیفیت، اور اندرونی تہہ تک پہنچ کر اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ ادیب نے اپنے ماحول اور عصر کا کہاں تک خیال رکھا ہے، اور پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کا ساتھ دینے میں حقیقت کو کس حد تک پیش نظر رکھا ہے؟ اس کا شعور

اور احساس اور ذہن کس درجہ بیدار ہے؟ اس کے بعد وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اپنے مواد کو پیش کرنے میں زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کرنے کے لئے کون سے فنی حربے استعمال کئے ہیں۔ وہ ادب اور سطحی قسم کے پروپیگنڈہ میں خاص طور پر فرق ملحوظ رکھتا ہے اور مواد اور ہیئت میں سے کسی ایک کی کمی اس کے نزدیک ادب کی بلندی اور عظمت کو ختم کر دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں اکثر ترقی پسند نقادوں نے بدقسمتی سے اس کی اصل ادبیت، لطافت اور عظمت کو چھین لینا چاہا اور اسے محض پروپیگنڈہ بنا کر رکھ دینا چاہا لیکن کچھ ہی روز بعد وہ سنبھل گئے اور جو اپنے سابق فیصلہ پر اڑے رہے اُن کو زبردست منھ کی کھانا پڑی چنانچہ ایسے تنگ نظر اور انتہا پسند نقاد جو ادب کو محض سطحی پروپیگنڈہ بنا کر رکھ دینا چاہتے تھے اور اپنے قدیم ادبی سرمایہ اور ماضی کی عظمت سے انکار کرتے تھے موجودہ زمانہ میں خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا کوئی نام تک نہیں لیتا۔ ترقی پسند نقادوں نے اپنی تنقید کے ذریعہ ادب میں اصلی اور ٹھوس قسم کی مادی زندگی کا شعور اور احساس پیدا کیا۔ اسے انسانی بہبودی کے لئے استعمال کرنے پر زور دیا، اجتماعیت اور انفرادیت میں توازن پیدا کیا، خارجیت اور داخلیت کے اصلی معنی سمجھائے اور اس کے تناسب کی طرف اشارے کئے، سطح سے تہہ کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف جانا سکھایا، زبان کو قومی اور مذہبی افتراق و اختلاف کی الجھنوں اور گرہوں سے نکال کر علمی اور سائنٹیفک طریقہ سے حل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور ان تمام راستوں سے ادب کا معیار بلند کیا اور اسے سطحیت کا شکار ہونے سے بچایا۔

ترقی پسند تنقید کے پیشرو حالیؔ کہے جا سکتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں اس کی ابتدا اختر حسین رائے پوری کے مضمون ادب اور زندگی سے ہوئی ہے۔ اختر رائے پوری کی تنقید میں طنز اور جھنجھلاہٹ بہت نمایاں ہے وہ سنجیدگی اور وقار نہیں جو تنقید کی شان بڑھاتا ہے اس میں شک نہیں کہ اُن کے یہاں علمیت اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن وہ توازن اور انصاف پسندی نہیں جو تنقید کو اُس کا اصل مرتبہ عطا کر سکے۔ وہ بڑے قطعیت پسند ہیں مگر اُن کی قطعیت میں اعتماد کم اور جلدی سے بغیر اچھی طرح غور کئے ہوئے بات کہہ دینے کی عادت زیادہ ہے۔ بہرحال ادب اور زندگی کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالنے میں اُردو کے ترقی پسند نقادوں میں سب سے آگے وہی رہے اور بلاشبہ اُن کی تنقید میں ایک اچھی اور ذہنی قوت کا اظہار ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم انھیں ترقی پسند نقادوں میں ایک اچھی حیثیت دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر احمد علی کی تنقید میں بھی کم و بیش وہی خصوصیات ہیں جو اختر رائے پوری کے ہاں ملتی ہیں مگر اختر رائے پوری پھر بھی ان سے زیادہ دھلی منجھی باتیں کہتے ہیں اور نسبتاً سلجھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبد العلیم کا نمبر آتا ہے۔ سجاد ظہیر کی تنقید اختر رائے پوری اور احمد علی کے مقابلہ میں زیادہ ادبی، واضح، متوازن اور سنجیدہ ہے۔ وہ چیزوں کو اچھی طرح اُن کے سماجی اور سیاسی پس منظر میں دیکھ کر اپنی رائے کا بہت ٹھہر ٹھہر کے اظہار کرتے ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ رائے دینے میں کسی قسم کی جھجک اور ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں بلکہ بے لاگ طریقے سے بہت سمجھ بوجھ کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اُن کی تنقید میں تاریخی شعور بھی ملتا ہے اور وہ قدیم ادبی سرمایہ کا بھی احترام کرنا جانتے ہیں اور ادبی تسلسل پر بھی نظر رکھتے ہیں اس وجہ سے اُن کی تنقید میں ایک خاص توازن، انصاف، اعتدال اور گہرائی اور ادبیت ملتی ہے۔ اور یہی ادبیت کی کمی ڈاکٹر علیم کی تنقید کی اہمیت سجاد ظہیر کے مقابلہ میں کم کر دیتی ہے ورنہ ڈاکٹر علیم بھی بہت واضح طور پر ادب کی توجیہ زندگی کے مظاہر اور اس کے پس منظر میں کر لیتے ہیں اور اسی وجہ سے ترقی پسند نقادوں میں ڈاکٹر علیم کو بھی اچھا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ فراق گورکھپوری ترقی پسند نقاد ہوتے ہوئے بھی اُن لوگوں سے کچھ مختلف ہیں۔ سجاد ظہیر، اختر رائے پوری اور ڈاکٹر علیم کی طرح اُن کے یہاں مارکسی اثرات کا احساس ملتا ہے لیکن اُن کا وہ وجدان اور شعور جو اپنے اندر اُردو کی قدیم شاعری اور خصوصاً تغزل کی تمام لطافتوں اور نزاکتوں کو جذب کر چکا ہے کافی حد تک نمایاں رہتا ہے اور ان تمام اثرات کی ترکیب و امتزاج سے اُن کا تنقیدی انداز پیدا ہوتا ہے اور انھیں ترقی پسند نقادوں میں ایک خاص اور منفرد جگہ بخشتا ہے۔ فراق صاحب نقاد سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی تنقید میں حیات و کائنات کے اہم اور زندہ مسائل اور انسانی تمدن اور تہذیب کے نمایاں عناصر کو ——— سمیٹ لے، اور ان کی روشنی میں ادیب و شاعر کی انفرادیت کے

خط و خال واضح کر دے اور دوسروں سے اس کا موازنہ کر کے اس کی منفرد اور مخصوص جگہ متعین کرے اور اس کی انفرادی شخصیت اور مزاج کو اجتماعی مسائل سے ہم آہنگ کر کے پیش کرے اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے فراق صاحب تنقید میں ایک سادہ مگر پُرکار اور پرتاثیر اسلوب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تاکہ نقاد قاری کے اندر لالچ اور آسودگی پیدا کر سکے۔ فراق ادب میں نئی سیاسی اور سماجی تحریکات کے اثرات پسند کرتے ہیں مگر ایسے بھرپور انداز میں جو قدیم شاعری کی تمام مہذب اور شائستہ لطافتوں سے متاثر ہو اور جس میں ایک نہایت لطیف اور پختہ وجدان کام کر رہا ہو۔ فراق صاحب نے بلاشبہ اردو تنقید کو بڑی بلندی تک پہنچایا ہے۔ لیکن اُن کے اندر خامیاں بھی ہیں جو غیر واضح ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی حیرت انگیز اور چونکا دینے والی بات کی خاطر سچی اور صاف بات کو قربان کر دیتے ہیں۔ مگر بہر حال اردو تنقید میں اُن کا درجہ بہت اونچا اور ممتاز ہے۔

ترقی پسند تنقید کو اس کا اصل منصب مجنوں، احتشام اور فیض وغیرہ کے ہاتھوں نصیب ہوتا ہے۔ مجنوں کے یہاں ایک طرف کلاسیکی ادب سے گہری واقفیت اور دوسری طرف ادب کی نئی تحریکات سے اچھی طرح شناسائی کا احساس ہوتا ہے اور اسی لئے جس قدر پختگی اُن کی تنقید میں ہے وہ کسی اور کے یہاں نہیں۔ مجنوں صاحب ترقی پسند ادب میں اس کی افادیت کے ساتھ ساتھ اس کی جمالیاتی اہمیت کے بہت قائل ہیں۔ وہ ادب سے زندگی کے بنانے اور سنوارنے کا کام لینے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن ادیب سے اپنے فن کی طرف بہت زیادہ توجہ دینے پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں جا بجا بڑے بڑے مغربی مفکرین اور تنقید نگاروں کے اقتباسات ملتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے لوگ مجنوں کی جدت اور اپج سے انکار کر دیتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ مجنوں یہ صرف اس لئے کرتے ہیں تاکہ اُن کی تنقید میں زیادہ سے زیادہ زور اور وزن پیدا ہو سکے۔ اس سے اُن کے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کا بھی بہت شدید احساس ہوتا ہے مگر اُن کی ترقی پسند ادبی نظریہ کے تحت لکھی ہوئی تنقید اور قدیم ادبی نظریہ کے ماتحت لکھی ہوئی تنقید میں بہت زیادہ بُعد ہے۔ بہت کم لوگوں کے نزدیک یہ عیب ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک شخص کی ذہانت، اس کے جاننے پہچاننے اور سمجھنے کی خواہش کے زندہ رہنے اور اس کی ذہنی ترقی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

مجنوں صاحب میں ایک خامی یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی قنوطیت پسند ہو جاتے ہیں اور ڈوب کر اچھی طرح اُبھر نہیں پاتے۔ مجنوں کے بعد احتشام حسین کا نمبر آتا ہے جنھوں نے ترقی پسند تنقید کے سلسلہ میں سب سے ــــ نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہے۔ احتشام صاحب نے جس سنجیدگی اور برگزیدگی اور حسن و خوبی کے ساتھ ادب کو مادی، سماجی، اقتصادی ــــ اور معاشری زندگی سے تعلق رکھنے والی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی ہے اور جتنی کامیابی حاصل کی ہے شاید ہی کسی دوسرے نقاد کو ہوئی ہو۔ وہ کسی تصنیف کی جمالیاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی اور معاشی اہمیت پر نظر رکھنا بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ احتشام صاحب نے مارکسی انداز نظر کو اپنا اصولِ تنقید بنا لیا ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں اُن کی ادبیت بُری طرح دب جاتی ہے مگر یہاں کی بات یہ ہے کہ اپنے اصول کو نبھانے اور اسے منطقی نتائج تک پہنچانے میں جس قدر کوشش اور کامیابی انھوں نے حاصل کی ہے اس سے آگے کا تصور کرنا بھی غیر ممکن ہی معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید کو کبھی معجون مرکب نہیں بننے دیا اور اپنے اصول پر بڑی سختی اور پامردی سے ڈٹے رہے۔ گو اس سے کبھی کبھی اُن کی ادبیت، لطافت اور شعریت کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ اپنے اصول کو نبھانے اور منطقی نتائج تک پہنچانے میں بقول عزیز احمد اُن کے قدم اُن تفصیلات میں بھی جا کر نہیں ڈگمگائے ہیں، جہاں دوسرے نہیں سنبھل سکتے اور یہ بڑی بات ہے۔ احتشام صاحب ایک جگہ ترقی پسند نقاد کے مطمح نظر سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب آج کا ... بھی ماضی کا ادب بن جائیگا اس وقت مستقبل کا نقاد اقبال، جوش، گپتا سانے، ہیرالال گودی والا، سمترانندن پنت، ٹیگور اور نذر الاسلام کو پڑھ کر بیسویں صدی کے ہندوستان، اس کے تمدن، اس کی بے چینیوں، تبدیلیوں اور رجحانات کا پتہ لگائے گا اور بتائے گا کہ انھوں نے کہاں تک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی تھی اور کہاں تک عام انسانی مفاد کو پیش نظر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ جذبات میں یہ روانی، خیالات میں یہ وسعت، تفکر میں یہ گہرائی، زبان کے استعمال میں

تنوع، جمالیاتی احساس کو یہ نیا تصور اُن کے یہاں کہاں سے آیا۔ اور اُنھوں نے اُسے کتنا کامیاب بنایا۔ یہ ہے ترقی پسند نقاد کا نقطۂ نظر
اس پورے اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب مواد اور ہیئت کے ایک متوازن امتزاج اور اتحاد کا نام ادب سمجھتے
ہیں جس میں سے کسی ایک کی کمی ادب کو ادب نہیں رہنے دیتی۔ احتشام صاحب سے اکثر لوگوں کو شکایت ہے کہ وہ اپنی تنقید میں وہ
اسلوبی کیفیت نہیں پیدا کر پاتے جو پڑھنے والے میں فوراً لالچ پیدا کردے اور یہ شکایت اُن کے اکثر مضامین کے دیکھنے سے حق
بجانب معلوم ہوتی ہے چنانچہ اپنے نئے مضامین خصوصاً "غالب کی بت شکنی" اور "اقبال بحیثیت شاعر اور فلسفی" میں اُنھوں نے
اس شکایت کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر اُن کے اسٹائل میں وہ لطافت، پُرکاری اور شعریت ہوتی جو آل احمد سرور،
فراق، مجنوں اور اختر انصاری میں پائی جاتی ہے تو شاید اردو ادب کا کوئی نقاد اُن سے آنکھیں نہ ملا سکتا۔ احتشام صاحب کے بعد
اُن کے سب سے بڑے مقلد عبادت بریلوی کا ذکر کرنا چاہئے کیونکہ باوجود تقلید کے اُنھوں نے بعض خصوصیات کی بنا پر اپنے لئے
اردو تنقید میں ایک نمایاں جگہ پیدا کرلی ہے۔

احتشام صاحب کے اصول کو اُنھوں نے بھی خوب نبھایا ہے لیکن اُن میں اپنی انفرادیت اور اپج کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ وہ
اس قدر طویل اور شاید اسی وجہ سے رُوکھے مضامین لکھتے ہیں کہ طبیعت پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگتا ہے اگر وہ ان کمیوں کو پورا
کرلیں تو اردو کے کامیاب نقادوں میں شمار کئے جائیں گے۔ اب میں ایک ایسے نقاد کا نام لینا چاہتا ہوں جس کو بہت سے لوگ بعض
غلط فہمیوں کی بنا پر ترقی پسند نقاد نہیں مانتے لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مطلب آل احمد سرور سے ہے۔ اگر اُن کو ترقی پسند نقادوں
میں نہ شمار کیا جائے تو پھر فراق اور بہت سے دوسرے ناقدین کو بھی ترقی پسندوں کی صف سے نکالنا پڑیگا۔ آل احمد سرور اپنی
تنقید میں بے لاگ خارجیت ( DISINTERESTED OBJECTION ——— ) پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ
اس کے بغیر کوئی نقاد ادب کی روح تک نہیں پہنچ سکتا اور ادیب یا شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ آل احمد سرور صاحب
قدیم شعر و ادب کی لے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اسی لئے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیتے وقت سب سے پہلے ادیب کو دیکھتے ہیں لیکن
اسی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانہ کی تمام تحریکات اور امکانات کے قائل ہیں اور اُن کا ذکر ادب میں بھی دیکھنا چاہتے۔ ان دو خصوصیتوں
کے امتزاج سے اُنھوں نے اپنے لئے ایک ایسا اصول بنایا ہے جسے ہم ترقی پسندی کا درمیانی راستہ کہہ سکتے ہیں۔ اُن کی تنقید میں بڑا
توازن اور اعتدال ہے، پھیلاؤ اور وسعت بھی ہے مگر وہ گہرائی اور اُپج اور ذہانت نہیں جو فراق، احتشام، مجنوں اور فیض وغیرہ
کے یہاں ملتی ہے مگر اُن کا اسٹائل خود اُنہیں کا اختراع ہے۔ جس میں اتنی مٹھاس، شعریت، اور لوچ ہے کہ پڑھنے والا فوراً متوجہ
ہوجاتا ہے اور لطف لینے لگتا ہے۔ کہیں کہیں سرور صاحب اپنے اسٹائل یا اسلوب میں لطافت، کیفیت اور شعریت پیدا کرنے میں
ایسی زبان لکھ گئے ہیں جس پر اُس طرح کی زبان کا دھوکہ ہونے لگتا ہے جو آزاد اور نذیر احمد وغیرہ کے زمانہ میں انھی کے تتبع میں
لکھی گئی ہو۔ اور جو "تمثیل" اور "داستان" یا "ادب لطیف" کے لئے مناسب ہو تو ہو لیکن تنقید کے لئے بالکل ناموزوں ہے۔ حالانکہ
اُن کے جو نئے مضامین شائع ہوئے ہیں اُن میں اس عیب کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فیض احمد فیض نے اتنی کم تعداد میں مضامین لکھے ہیں کہ کم ادر معمولی طور پر پڑھنے والے اُنھیں نقاد کی حیثیت سے نہیں جانتے۔
لیکن حقیقتاً وہ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی باتوں کو نہایت
گہرائی اور خوبی کے ساتھ تنقید میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کس طرح سمیٹا جاتا ہے تو وہ فیض کے تنقیدی مضامین پڑھے۔
فیض بھی مارکسی اندازِ نظر کو اپنا اصول تنقید بناتے ہیں لیکن اُن میں ادبیت اور شعریت اس قدر نمایاں ہے کی داد دیئے بغیر نہیں
رہا جاتا۔ فیض نے اردو ادب میں مختصر تنقید کی ابتدا کی اور چاہئے تو یہی تھا کہ وہی اس کو عروج پر پہنچاتے لیکن افسوس کہ وہ شاعری کی
طرح اس باب میں بھی محتاط بلکہ سُست ہیں۔ اب دیکھیں کون اللہ کا بندہ اسے ترقی دیتا ہے۔ کاش کہ وہ خود اس طرف متوجہ ہوتے۔

فیض کے بعد ایک ایسے نقاد کا ذکر کرنا ہے جس نے ہر طرح کے ادبی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ لیکن افسانہ نگاری کے ساتھ وہ خاص طور پر وابستہ ہے۔ افسانہ نگاری کا ذکر آتے ہی وقار عظیم کا نام آنا بھی ضروری ہے۔ وقار عظیم نے خاص طور پر ان ترقی پسند رجحانات کی روشنی میں افسانوں اور افسانہ نگاروں کو پرکھا ہے جو موجودہ افسانہ نگاری پر غالب ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے تمام ترقی پسند افسانہ نگاروں کا نہایت تفصیل سے مطالعہ کیا ہے اور اپنی تنقید میں ان کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے لیکن ان کی تنقید میں کسی خاص قوت، زور، ذہانت اور پختگی کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ انھوں نے اچھا کیا کہ اپنی تنقید کو افسانہ نگاری کے ساتھ مخصوص کر کے اپنے کو بہت جلد نمایاں کر لیا۔ ان لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر، عزیز احمد، اعجاز حسین، ممتاز حسین، علی جواد زیدی، علی سردار جعفری، اختر انصاری، ظہیر کاشمیری، سبط حسن وغیرہ کے نام بھی ترقی پسند نقادوں میں لئے جا سکتے ہیں۔

حال میں زبان کے حل کے سلسلہ میں بھی ترقی پسند نقادوں نے بڑی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اور ڈاکٹر تارا چند، غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت سندر لال، کشن پرشاد کول، برجموہن کیفی، اور سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کی مدد سے سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، احتشام حسین، فراق اور دوسرے ترقی پسند نقادوں نے زبان کے بارے میں تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور علمی انداز میں زبان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے بہر حال اردو ادب میں ترقی پسند تنقید نے ہر پہلو سے بہت سے اضافے کئے ہیں اور اس کا معیار بلند کیا ہے اور اس کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## (بقیہ "لامتناہی سلسلہ"۔)

ہے نہیں۔ یہ تمہیں بلانا بھی چاہتے تھے، تم وہاں چلی جاؤ۔ ذرا جی بہل جائے گا"

"Oh dady how sweet of you!"

ابھی انھیں باتیں کرتے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ منیر آ گیا۔ اس کے ابا منیر کو دیکھتے ہی بول اٹھے،

"آؤ بھئی منیر آؤ۔ کہو کیسے آنا ہوا"

"جی بس یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں۔ کئی دنوں سے آپ سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ آج جی چاہا کہ چل کر آپ سے ملوں"

"بڑی مہربانی"، وہ بول اٹھی۔

اس کے ابا اور منیر باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے کبھی منیر کو اور کبھی جیک کو دیکھ رہی تھی۔ اور اسے پہلی بار یہ خیال آیا کہ منیر کا رنگ کتنا کالا ہے۔ بالکل اس شیروانی سے ملتا جلتا جو اس نے کچھ دن پہلے پہنی ہوئی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں جیک کارلٹن کا سرخ و سفید رنگ، اس کا بھرا ہوا مضبوط جسم اور سنہری رنگ کے بال جو بار بار ہیٹ پہننے اور اتارنے کی وجہ سے بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کا فرق کتنا نمایاں تھا۔ اور اس کا دل بول اٹھا کہ اسے منیر سے کبھی محبت نہیں ہے یہ تو یہاں نئی جگہ ہونے کے باعث تنہائی سے اکتا کر وہ منیر سے مانوس ہو گئی تھی۔ ورنہ در اصل اسے منیر سے بالکل محبت نہیں۔

اس کے ابا اٹھ کر ہاتھ منھ دھونے اندر گئے۔ تو منیر نے کہا دو ردی ٹکٹ تو میں لے آیا ہوں۔ اب بتاؤ چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟

"منیر (I am so sorry.) دیکھو ابا کے دوست مسٹر جیک کارلٹن کے ہاں آج ڈانس ہے۔ اور یہ خاص طور پر ابا کے ساتھ مجھے لینے آئے ہیں۔ آج تو میں نہ جا سکوں گی"

جب وہ دوبارہ اپنے کمرے میں ڈانس کا لباس پہننے کے لئے گئی۔ تو اس نے جلدی سے منیر کو تصویر کو بھی میز پر پڑے ہوئے فریم سے نکال کر البم میں لگا دیا۔ اسے ان میں سے کسی ایک سے بھی سچی محبت نہ ہوئی تھی۔

اشتیاق عارف

# فسادی ادب پر فساد

نگار کے گذشتہ شمارہ میں انتصار نیوتنوی کا مقالہ "فسادی ادب" شائع ہوا ہے۔ افسوس کہ اس پر ادارہ کا لکھا ہوا "اختلافی نوٹ" اشاعت سے رہ گیا۔ بہرحال "فسادی ادب" کا موضوع اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ اس پر ہم انتصار نیوتنوی کے مقالہ سے کلیتاً متفق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انھوں نے "فسادی ادب" پر جس فیصلہ کن انداز میں قلم اٹھایا ہے وہ ہماری دانست میں صحیح نہیں "فسادی ادب پر فساد" اشتیاق عارف کا مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اشتیاق عارف نے جس خلوص اور گہرائی سے "فسادی ادب" کا تجزیہ کیا ہے وہ یقیناً ہمارے صاحب نظر تنقید نگاروں کی توجہ کا مستحق ہے اور ضرورت ہے کہ وہ ادیب جو ابتک اس ضمن میں خاموش ہیں ــــ قلم اٹھائیں اور "فسادی ادب" کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی پس منظر پر دیانتدارانہ روشنی ڈالیں تاکہ آج کا ادب بے نتیجہ الجھاؤ اور رجعت پسندوں کے مصلحتی پروپیگنڈہ سے محفوظ رہ سکے اور ادب کے اس انقلابی لیکن زندگی کی کشمکش اور ارتقا سے وابستہ موضوع پر دور تک سوچا جا سکے۔

"فسادی ادب" پر فیصلہ کن انداز میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ البتہ اسے موضوع بحث بنا کر ادب کی ارتقائی رفتار کا جائزہ ضرور لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم ملک کے تمام نقادوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں اپنے خیالات کے اظہار سے اب گریز نہیں کریں گے۔　　(ادارہ)

برعظیم ہند کی آزادی سے ذرا پہلے اور اس کے بعد جو ہمہ گیر فسادات ہوئے اُن سے اُردو ادب میں ایک نئے لٹریچر کی تخلیق ہوئی ہے جسے "فسادی ادب" کہا جاتا ہے۔ ادیبوں نے انسانوں کی دہشت و بربریت کو جس حوصلہ مندی اور بے جگری سے معلوم کیا اور اس بے مقصد خون خرابی کی جو ہولناک تصویریں کھینچی ہیں اُن پر اب کئی طرف سے تنقیدی نظریں پڑ رہی ہیں۔ پاکستان کے متعدد رسائل میں فسادی ادب پر اچھی خاصی بحثیں چلی ہیں، یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس ضمن میں ابھی تک جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس میں تنقید نگاروں نے نقادی کے اعلیٰ اصولوں کو نظر انداز کر کے یا تو حکومت کے رجحان کی عکاسی کی ہے ورنہ تنقید کرتے کرتے وہ خود بھی الجھ گئے، الفاظ کے ہیر پھیر میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکے۔

حسن عسکری کی رائے سے قطع نظر انتظار حسین صاحب نے تو "نقوش" لاہور، میں فسادی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے افسانہ نویسوں نے ان فسادات کے متعلق جذبات کی قے کی ہے۔ انتصار نیوتنوی صاحب نے اس ادب کو پروپیگنڈہ سے تعبیر کرتے ہوئے ملک کے لئے شرمندگی کا باعث بتایا ہے۔ انتصار صاحب اور انتظار صاحب کے مقالوں کی تنقیدی قدر خواہ کچھ بھی ہوں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ دونوں میں کرشن چندر کے لئے "عناد" کی حس مشترک نظر آتی ہے۔ آج کی تنقید میں جھلاہٹ کی شکایت عام ہو گئی ہے۔ لیکن کرشن جیسے چوٹی کے فنکار کے حق میں عناد آمیز جھلاہٹ کا مظاہرہ کر کے کوئی بڑا سے بڑا نقاد اس کی عظمت کو کم نہیں کر سکتا۔

بہرحال آج کا ادب حالات و مشاہدات سے بے تعلق ہو کر تخلیقی کام کرے، یہ ناممکن ہے۔ وہ قومی اور ملکی مسائل پر نگاہ نہ رکھے تو اس سے کسی اجتماعی معاوضہ زندگی کی صحیح ترجمانی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ قومی مسائل اور روزمرہ کے حوادث سے آنکھیں بند کر کے

الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ جیسا تفریحی لٹریچر پیدا کیا جا سکتا ہے، عشق کی داستانیں دہرائی جا سکتی ہیں اور اعلیٰ طبقے کے لئے ناقابلِ قیاس واقعات پر مبنی کتابیں لکھی جا سکتیں۔ لیکن دکھی اور سہمی ہوئی انسانیت کو تسلی نہیں دی جا سکتی۔ اچھے ادب کی تخلیق کا نعرہ، سماج کی بگڑی ہوئی حالت، عام بے چینی اور بدامنی اور اقتصادی بدحالی کی موجودگی میں کوئی کشش نہیں رکھتا۔ جو لوگ اس نظریہ کے حامل ہیں کہ "ادب اور آرٹ میں زندگی کے وہ عناصر شامل ہوئے ہیں جن کا تعلق براہ راست تکلیف، بھوک اور غربت سے نہ ہو"، وہ ممکن ہے اتنے سنگدل ہوں کہ قحط بنگال کی لرزہ خیز تصویروں نے انھیں بالکل متاثر نہ کیا ہو اور فسادات کے شکار ہونے والے لاکھوں یتیموں، بیواؤں اور اغوا شدہ عورتوں کے دلدوز مصائب سے اُن کے دل نہ پسیجے ہوں۔ لیکن کرشن چندر، احمد عباس، بیدی، ہاجرہ مسرور، اور اسی زمرہ کے کئی ادیبوں نے تاریخ کے اس بحرانی دور میں اپنے جذبات پر عقل کے پہرے گوارا نہیں کئے وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح اس کشت و خوں ریزی سے متاثر ہوئے۔ جب سیاست، سماج، اخلاق اور تہذیبی تصورات فنا ہوئے جا رہے تھے اس وقت عام قنوطیت اور مایوسی کو ان ادیبوں نے روکنے کی کوشش کی۔

اس کوشش میں ادیبوں کے جذبات و احساسات کو زیادہ دخل۔ ہر حساس دل و دماغ کا گرد و پیش کے بگڑتے ہوئے حالات سے متاثر ہونا فطرتی چیز ہے۔ ہنگاموں کے خونیں مشاہدات سے جس ادب کی تخلیق ہوئی ہے اس میں انسانوں کو لعنت ملامت کا نشانہ ہی نہیں بنایا گیا بلکہ بھڑکے اور بہکے ہوئے انسانی مزاج کو ٹھنڈا کرنے کی مخلصانہ سعی کی گئی۔ جب کلچری اور سماجی نقشے بگڑ رہے تھے اس وقت ادب برائے ادب کے حامی ادیب تو البتہ اضمحلال میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کیونکہ انھیں انقلاب کے تخریبی پہلوؤں سے کوئی سروکار یا واقفیت ہی نہیں تھی لیکن جو ادیب یہ دیکھ رہے تھے کہ قوم اور ملک کس تباہی کی طرف جا رہے ہیں انھیں اس کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ اس مصنوعی انقلاب کی تکمیل پر ادب و فن کا کیا حشر ہوگا۔

جس حد تک مشاہدات اور تخلیق کے مابین کسی زمانی فاصلے کا تعلق ہے اس پر خود ادب کی بھلائی کے لئے اصرار نہیں کیا جا سکتا اول تو واقعی بہ قول ہاجرہ مسرور یہ ایسی پابندی ہے جسے کوئی ادیب قبول نہیں کر سکتا دوسرے اگر اسے اصول بنا لیا جائے تو ادبی تخلیق میں وجدان اور فوری تحریک کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ منطق کی رو سے کھینچ تان کر جو چاہے کہہ دیا جائے لیکن ادیب مستقبل کے انتظار میں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ یہ حالات و واقعات ہی ہیں جو اُسے لکھنے کے لئے اکساتے ہیں، وہ لکھنے میں سرگرم ہو جاتا ہے اور اچانک کوئی اعلیٰ تخلیق ظہور میں آ جاتی ہے۔ "فسادی ادب" پر تنقید کرنے والے ان اعلیٰ تخلیقات کا ذکر دانستہ طور پر نہیں کرتے جو کرشن اور احمد عباس نے اردو ادب کو دی ہیں اور یہیں سے ان کی دیانت پر حرف آتا ہے۔ تنقید نگار سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ اچھائی اور برائی میں توازن قائم کر کے دکھائے بلکہ کہنا یہ ہے کہ صحیح جائزہ اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب کہ تخلیقات کو ترچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ملک کو دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہ "تمدنی دھچکا" ذرا بعد میں لگا ہے اسی لئے افراط و تفریط کی شکایت ہے۔ مغربی ادب کے علاوہ دنیا کی تمام زندہ ادبیات میں ہمیں وہاں کی تہذیبی، تمدنی اور سیاسی ارتقا کی تاریخ ملتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے روس، برطانیہ اور امریکہ کی عام زندگی پر جو نقوش چھوڑے ہیں اُن سے وہاں کے لٹریچر میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ اس چار پانچ سال کے عرصے میں وہاں اچھی تخلیقات ہوئیں جن کے موضوعات بعید از قیاس واقعات نہیں ہیں۔ مابعد جنگ کے مسائل، معاشی بحران، بے روزگاری، اقتصادی بحالی اور سوسائٹی میں بڑھتا ہوا کرپشن، یہی وہ موضوعات ہیں جن کو مغربی ادب کو شاہکار تخلیقات نصیب ہوئی ہیں۔ ان موضوعات سے کنارہ کشی اختیار کر کے ادیب وہاں کے قاری کو کوئی اچھوتی تخلیق نہیں دیتا۔ ہندوستان کے فسادی ادب میں جن لوگوں کو کوئی مقصد نظر نہیں آتا وہ دراصل فریب خوردہ ہیں یا انھیں انسانیت سے لگاؤ نہیں ہے۔ وہ لاکھوں انسانوں کو ذبح ہوتے دیکھ کر ٹس سے مس نہیں ہوئے اور اگر ادیبوں نے آواز اٹھائی تو اس میں انھیں کسی

غیر ملک کا ہاتھ نظر آیا۔ لاکھوں عورتوں کی عصمتیں لٹنی ہیں اور وہ انقلاب کے مکمل ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

فسادی ادب کو فوری جذبے کی پیداوار کہنا بھی غلط ہے۔ ہنگامے ایک دو دن کے نہیں تھے، طویل عرصے تک ان کی بدولت قوم کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور اب بھی ہندوستان و پاکستان میں بے شمار لوگ مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ امن و امان قائم کرنے، پناہ گزینوں کو پھر سے بسانے اور بے کار لوگوں کو کام مہیا کرنے میں ایک سال لگ گیا۔ ساری قوم کو اس مدت میں گوناگوں آلام کا سامنا کرنا پڑا، بڑی بُرائی سے کئی قسم کی چھوٹی برائیاں پیدا ہوئیں۔ اس قومی مصیبت نے زندگی کے ہر رُخ پر اثر ڈالا۔ اگر اسے سیاسی تبدیلی کا نتیجہ کہا جاتا ہے اور یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ کوئی دوسری چال اس کی جگہ لے سکتی ہے تو یقیناً ادب پر بھی کوئی ٹھہراؤ پیدا نہیں ہو سکتا۔ فرد کی زندگی کی اہم تبدیلی کا پتہ لٹریچر دیتا ہے تو قوم کی اجتماعی زندگی ادب میں ضرور منعکس ہوگی۔

عزیز احمد نے اس ضمن میں کچھ نہیں لکھا تو اسے خوبی نہیں سمجھا جا سکتا، "گریز" کے مصنف کو اتھارٹی قرار دیکر دوسروں کی رہنمائی نہیں کی جا سکتی۔ قرۃ العین حیدر جس آئی، سی، ایس، طبقے کی ترجمانی کرتی ہیں اس کا تمدن عوام کے تمدن سے بالکل مختلف ہے اور یہ طبقہ اس دوران میں تماشائی بنا رہا۔ پھر یہ طبقاتی کشمکش بھی تو نہیں تھی۔

ترقی پسند ادیبوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو نیا ادب پیدا کرنے میں پہل کی اس پر مخالف کیمپ میں حسرت آمیز جھنجلاہٹ پیدا ہونا انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ بہر حال ادب میں نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے، نئی نئی بات ہے اسی لئے کوئی اسے سیاسی پروپیگنڈہ قرار دیتا ہے اور کوئی اسے وقتی ہنگامہ آرائی سے تعبیر کرتا ہے۔ پاکستان میں تو سرکاری شہ پر ترقی پسند تحریک کو آڑے ہاتھوں لیا جا رہا ہے۔ "نقوش" میں جن لوگوں کو کوئی اپچ یا اُبھار نظر نہیں آیا وہ اسی قبیل کے لوگ ہیں جن سے سرکاری ڈھنڈورچی کا کام لیا جا رہا ہے۔

پاکستان کے مہاجرین کی زندگی سے متعلق اگر کسی ادیب نے سچی باتیں لکھ دیں تو اس سے کون سی تخریب ہوئی، جب قوم تشکیل کے مرحلے پر ہوتی ہے تو اس کے بنانے میں قوم کے ہر فرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ادیب اپنے قلم سے برائیوں کو دور کرنا چاہتا ہے، سیاستداں اپنے تدبر سے بگڑی کو بناتا ہے پاکستان میں ناقص نظام کے خلاف ادیبوں کا قلم اُٹھا، ترقی پسند ادیب حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے، ملک میں افسردگی اور مایوسی پھیلانا اس کا آدرش نہیں ہے۔ حکومت کے نظام میں کوئی لچک نہیں تھی اسی لئے اس نے ادبی رسائل کی آواز بند کر دی۔ اس فسطائی اقدام کو ادب کی حفظانِ صحت کے لئے مناسب قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی پاگل کو رہبر تسلیم کر لیا جائے۔ ایک طرف ملت کے نام پر اور دوسری طرف قوم کے لئے عوام کے جائز مطالبات کو پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ادیب حکومت کے باغی بھی نہیں ہیں۔ ترمن کے بندے انھیں گھسیٹ کر باغیوں کی صف میں لا کھڑا کرنا چاہتے ہیں لیکن جمہوریت کے چوغے میں شہنشاہیت کو لپیٹ کر ادیب کو اس کے سامنے سرنگوں نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر سماج، بہتر نظامِ حیات اور مساویانہ حقوق کیلئے ادیب برابر جد و جہد کرتے رہیں گے۔

"ہم وحشی ہیں" "اور خونی ہے ہندستان" میں فسادات پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس سے ذہنیتوں میں اس قدر تو تبدیلی ہوئی کہ لوگ شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ اب سکون قائم ہوا تو لوگوں نے اپنی بہیمیت اور دیوانگی کے ان خاکوں پر نظریں ڈالیں جو ادیبوں کے نوکِ قلم سے تیار ہوئے ہیں۔ فسادی لٹریچر پیدا کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انسان اپنی حد سے گزری ہوئی پستی پر تاسف کرے اور شرمندہ ہو۔ کسی طرح تو ناحق کی خوں ریزی بند ہو۔ اگر ملک کی شرمندگی کا مفہوم یہ ہے کہ فسادی ادب نے ہمارے ماتھے پر سیاہی لگا دی تو یہ اس لئے غلط ہے کہ احمقانہ قتل و غارتگری کی بنا پر ہم پہلے ہی اقوامِ عالم کی نظروں سے گر چکے ہیں۔ تمام ادیبوں پر بالعموم اور کرشن پر خاص طور سے یہ لکھا گیا ہے کہ اس نے اپنے افسانوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا نقصان بتلانے میں رواداری سے کام لے کر ادب کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اُس نے ہر موقع پر توازن قائم رکھنے کی،

(باقی صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

وی نیمیرووسکی

# اشتراکی ریاست لینن اور اسٹالن کی نظر میں۔

اگست اور ستمبر ۱۹۱۷ء میں لینن کرینسکی کی پولس کے ہاتھوں گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور مسلح بغاوت کی تیاریوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اسی دوران میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "ریاست اور انقلاب" تصنیف کی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے بتایا کہ "نظریاتی طور پر اور عملی سیاست میں ریاست کا مسئلہ نہایت اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے" کیونکہ "بورژوازی (سرمایہ دار طبقہ) کے اثر سے عام طور پر اور سامراجی بورژوازی کے اثر سے خاص طور پر محنت کش عوام کی جدوجہد آزادی کو پاک کرنا "ریاست" کے متعلق رجعت پسند تعصبات کے خلاف جدوجہد کے بغیر ناممکن ہے۔"

اس تصنیف میں کسی اور مقام پر لینن نے لکھا ہے کہ بورژوا سائینسدانوں، فلاسفروں، قانون دانوں، سیاسی معیشت کے ماہرین اور اخبار نویسوں نے ریاست کے مسئلہ سے زیادہ کسی اور مسئلہ کو اس طرح جان بوجھ کر پیچیدہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بورژوا سائنسدانوں نے بار بار کوشش کی ہے کہ ریاست کو ایک "فوق القدرت" اور "دوامی" شے ظاہر کریں۔ لیکن یہ سب جتن محض اس لئے کئے گئے تھے کہ عوام کی لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے ریاست کی طبقاتی خاصیت کو پوشیدہ رکھ سکیں۔

مارکس اور اینگلس نے ثابت کیا تھا کہ ریاست کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جبکہ سماج طبقوں میں تقسیم ہوا۔ اس وقت ریاست کو حکمراں طبقہ نے مظلوم اور لوٹی کھسوٹی ہوئی اکثریت کے خلاف اپنے حربہ کے طور پر استعمال کیا۔ غلاموں کے مالک قدیم مشرقی ظالم حکمرانوں کے وقت سے لیکر موجودہ زمانہ کی بورژوا مجلسی جمہوریتوں تک تمام ریاستوں کا لب لباب یہی ہے۔ مارکس اور اینگلس اس نتیجہ پر پہونچے کہ محنت کش عوام کو استحصال سے نجات دلانے اور غیر طبقاتی اشتراکی سماج کے قیام کے لئے مزدور طبقہ کو سب سے پہلے بورژوا اقتدار کی کل، بورژوا ریاست کو ختم کرنا چاہئے اور حکومت کی طاقت خود سنبھال لینی چاہئے۔

مارکس اور اینگلس کے اس فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے اور انقلابی جدوجہد کے بیش بہا تجربات سے نتائج اخذ کرتے ہوئے لینن نے پرولتاری (دفاش مزدور طبقہ) کے انقلاب اور پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کا نظریہ قائم کیا۔ اس کے بعد کی تاریخ نے لینن کے نظریہ کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں بورژوازی کا تختہ الٹنے کے بعد روس کے مزدور طبقہ کو نہایت زبردست اور تاریخی فرائض انجام دینا درپیش ہوا۔ یہ ضروری تھا کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے شکست خوردہ طبقہ کی مدافعت کچل دی جائے، مداخلت کرنے والے بیرونی ممالک کی فوجوں کو مار بھگایا جائے، زار شاہی کے ورثہ یعنی اقتصادی انتشار، اور اقتصادی اور تہذیبی پس ماندگی پر عبور حاصل کیا جائے اور اس کے بعد اشتراکی سماج کی اقتصادی بنیادیں تعمیر کی جائیں۔

انقلاب سے پہلے ہی لینن نے بتایا تھا کہ اشتراکی اصولوں پر سماج کی از سر نو تعمیر اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ عوام اپنی تخلیقی قوتوں کا استعمال خود اپنے طور پر کریں، اور عوام کو ریاست کے نظم و نسق میں شامل کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے بورژوا مجلسی جمہوریت بالکل نامناسب تھی۔ اس طرح ریاست کا تمام نظم و نسق اور نظام بورژوازی کے مفاد کے تابع ہو جاتا، اور محنت کش عوام دائمی طور پر ان کے بندھنوں میں جکڑ جاتے۔ بورژوا مجلسی جمہوریت عوام کو ریاست کے معاملات میں اپنا حصہ ادا کرنے سے مانع رکھنے کے ایک وسیلہ کا کام کرتی۔

برسرِ اقتدار آنے کے بعد مزدور طبقہ سماج کی اشتراکی تعمیر میں ریاست کے بورژوا کل پرزوں کو استعمال نہیں کرسکتا تھا لازم تھا کہ وہ خود اپنی ریاست کی تخلیق کرے۔ وہ ایک نئی طرز کی ریاست ہو جس میں حکومت کی طاقت استحصال کرنے والی اقلیت کے نہیں بلکہ ــــ اب تک ان کے شکار، محنت کش عوام کی اکثریت کے ہاتھ میں ہو۔ یہ نئی طرز کی ریاست خود عوام نے انقلابی جدوجہد کے دوران میں روس میں تخلیق کی۔ ریاست کی نئی طرز کی حکومت یعنی پنچایتی حکومت کی دریافت کا سہرا لینن ہی کے سر ہے۔

تاریخی نشو ونما کے دوران میں ہی مزدور نمائندوں کی پنچائتیں عالمِ وجود میں آئیں۔ ان کے قیام کی ابتداء ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے دوران میں ہوئی۔ زارشاہی اور بورژوازی کے خلاف عوام کی انقلابی جدوجہد کے دوران میں رہنمائی کرنے والے ادارے یعنی ان پنچایتوں کو لینن سمجھتے تھے کہ مزدور انقلاب کی کامیابی کے بعد انھیں اداروں کو ریاست کے حکمراں اداروں کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

پنچائتوں کی قوت کا راز کیا ہے؟ دیگر اقسام کی ریاستوں کے حکمراں اداروں سے پنچائتیں کس صورت سے بہتر ہیں؟

لینن نے دیکھا کہ ان کی فوقیت اور ان کی قوت کا منبع یہ ہے کہ پنچائتوں کے ذریعہ ریاست کے نظم ونسق میں تمام لوگ عملی طور پر حصہ لے سکتے ہیں۔ اور اشتراکی سماج کی تعمیر میں اپنا پورا پورا حصہ ادا کرسکتے ہیں۔ اسٹالن نے بھی پنچائتوں کی اس خصوصیت پر زور دیا اور بتایا کہ عوام کو صرف ووٹ ہی نہیں دینا چاہئے بلکہ انھیں ملک پر حکومت کرنی چاہئے۔ پنچائتی حکومت صحیح معنوں میں عوامی حکومت کا مرقع ہے، رسمی نہیں بلکہ حقیقی جمہوریت ہے۔

سویت یونین میں استحصال ختم کرنے اور اشتراکی سماج کی تعمیر میں ریاست کی صرف سویت طرز حکومت ہی موثر ثابت ہوئی۔ سویت حکومت نے زمینداروں اور سرمایہ داروں سے ذرائع پیداوار چھین لئے اور عوام کو سپرد کردیئے۔ ریاست کے تمام ادارے اور ملک کی مسلح فوجوں کی تشکیل میں عملی طور پر اور نظریاتی طور پر مزدور حصہ لیتے ہیں اور حکومت اور فوج عوام کے مفاد کی حفاظت کرتی ہے۔ سویت ریاست میں سب سے پیش پیش اور اس کی روح رواں کمیونسٹ پارٹی ہے جو کہ مزدور طبقہ اور عام طور پر تمام محنت کش عوام کے مفاد کا اظہار کرتی ہے۔ پنچائتی ریاست اشتراکی ریاست ہے۔

پنچائتی اقتدار کے ابتدائی دور میں ہی پنچائتی جمہوریت عوام کی بہت بڑی اکثریت کی جمہوریت ثابت ہوچکی تھی۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والے شکست خوردہ طبقوں کے نمائندوں کو پنچائتی ریاست کی سیاسی زندگی میں برابر کا درجہ نہیں دیا گیا تھا کیونکہ وہ اب بھی محنت کش عوام کے برسرِ اقتدار آجانے پر ان کے خلاف سخت ترین جدوجہد کر رہے تھے۔ لیکن ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ انھیں نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔

سویت یونین میں لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقوں کے خاتمہ اور اشتراکیت کی تعمیر شروع ہوجانے کے بعد پنچائتی اشتراکی جمہوریت اور بھی بلند معیار پر پہونچ گئی ــــ تمام عوام کی جمہوریت بن گئی۔

سویت یونین میں تمام طاقت شہروں اور دیہات کے محنت کش عوام کے ہاتھوں میں مرکوز ہے اور ان کی نمائندگی محنت کش عوام کے نمائندوں کی پنچائتیں کرتی ہیں۔ ریاستی اقتدار کے تمام اداروں ــــ سویت یونین کی مجلس اعلیٰ (پارلیمنٹ) سے لیکر شہر اور دیہات کی پنچائت تک ــــ سب کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے اور ہر بالغ کو رائے دینے کا بلا امتیاز برابر کا حق ہوتا ہے۔ رائے دہندگان پر جائداد کی ملکیت، تعلیم کی کوئی قید نہیں ہوتی اور نہ ہی قومیت کسی صورت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن ریاست کے نظم ونسق میں عوام کا حصہ محض انتخابات ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر ممبر کو اپنے رائے دہندگان کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا ہے اور انھیں اپنے کام کی رپورٹ پیش کرنی ہوتی ہے۔ اگر وہ عوام کے اعتماد کو حق بجانب ثابت کرنے میں ناکام ثابت ہوتا ہے تو اسکو واپس بھی بلایا جاسکتا ہے۔ پنچائتوں کی سرگرمیوں پر عوام کا ہر وقت کنٹرول رہتا ہے اور لاکھوں مزدور، کسان اور علم داں

لوگ ان کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیتے ہیں۔

جس کام کو لینن نے شروع کیا تھا اسے اسٹالن نے دیگر معاملات کے علاوہ اشتراکی ریاست کی تعمیر کے سلسلہ میں بھی جاری رکھا۔ پنچایتی نظام حکومت سے تجربہ حاصل کرنے کی بنیاد پر پرولتاری (مزدور) حکومت کے اصولوں کی وضاحت کرنے سے موت نے لینن کو باز رکھا۔ لیکن لینن جو کام ادھورا چھوڑ گئے اسٹالن نے اُسے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ سویت یونین میں اشتراکیت کی فتح و کامرانی سے اشتراکی حکومت کے نشوو ارتقا اور اس کی آئندہ نشوونما کے امکانات کا مسئلہ پیدا ہوا۔ کمیونسٹ پارٹی کے اٹھارویں اجلاس میں اسٹالن نے اپنی رپورٹ میں ان سوالات کا مفصل جواب دیا اور یہ جواب خصوصیت سے سویت ریاست کے نظریاتی تجربہ کی بنیاد پر دیا گیا تھا۔

اسٹالن نے بتایا کہ سوشلسٹ ریاست اپنے نشوونما کے دوران میں دو منزلوں سے گذری اور ملک کی ترقی اور نئے بین الاقوامی حالات کے پیش نظر اس کے فرائض میں تبدیلیاں رونما ہوگئی ہیں۔ پہلا دور اکتوبر انقلاب سے شروع ہوکر لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقوں کے خاتمہ پر پہونچا۔

اس دور میں اشتراکی ریاست کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ استحصال کرنے والے شکست خوردہ طبقوں کی مدافعت کچلی جائے اور بیرونی حملے سے اشتراکی سماج کی حفاظت کی جائے۔ دوسرا دور استحصال کرنے والے طبقوں کی شکست کے بعد سے اشتراکیت کی تعمیر کے مکمل ہونے اور اسٹالن دستور حکومت منظور ہونے تک رہا۔ اس دور میں حکومت کے اندرونی طبقوں کو کچلنے کا کام ختم ہوگیا ہے کیونکہ لوٹ کھسوٹ کا بالکل خاتمہ کر دیا گیا تھا، لوٹ کھسوٹ کرنے والا اب کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اس لئے کوئی ایسا طبقہ باقی نہیں رہا تھا جس کی سرکوبی کی جائے۔ (اسٹالن) اس دور میں معیشتی، تنظیمی، تہذیبی اور تعلیمی کام سامنے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ ملک کو بیرونی حملے سے محفوظ رکھنے کا کام اب بھی باقی تھا کیونکہ اس قسم کے حملوں کا خطرہ باقی ہے اور اس وقت تک باقی رہیگا جب تک کہ سویت یونین مخالف سرمایہ دار ممالک سے محصور ہے۔

اب سویت یونین اپنی نشوونما کے تیسرے دور میں داخل ہوگیا ہے —— یہ دور مزید ترقی کا ہے، اشتراکیت سے کمیونزم تک پہونچنے کا عبوری دور۔ کیا کمیونزم کے دور میں ریاست کا وجود باقی رہیگا؟ اس سوال کا اسٹالن جواب دیتے ہیں کہ "ہاں، ریاست اس وقت تک باقی رہیگی جب تک کہ سرمایہ دار ممالک کا محاصرہ ختم نہ ہو جائے اور جب تک بیرونی لشکر کشی کا خطرہ ختم نہ ہو جائے۔ اشتراکی ملک کی اپنی خود کی فوج ہونی چاہئے اور نتیجہ کے طور پر ایک ایسی ریاست بھی جو بیرونی لشکر کشی سے اشتراکیت سے حاصل کردہ نتائج کی حفاظت کرنے کے لئے کافی طاقتور ہو۔ اسٹالن نے ریاست کے آہستہ آہستہ ختم ہو جانے کے موقع پرست خیالات کا منہ توڑ جواب دیا اور سویت عوام کے سامنے اشتراکی ریاست کو مستحکم کرنے اور اس کی مسلح فوج کو مضبوط کرنے کے فرائض پیش کئے۔

واقعات نے ثابت کر دیا کہ اسٹالن اعظم نے کس دوربینی سے کام لیا۔ فاشسٹ جرمنی کی عیارانہ لشکر کشی کا اشتراکی ریاست نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور شاندار فتح حاصل کرکے دنیا کو دکھا دیا کہ اس کی قوت ناقابل تسخیر ہے۔ اشتراکی ریاست نے نہ صرف اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھا بلکہ یورپی ممالک کے عوام کو فاشسٹ غلامی سے نجات دلائی اور بنی نوع انسان کو فاشی خطرے سے محفوظ کر دیا۔ حب الوطنی کی جنگ عظیم میں سویت عوام کی فتح پنچایتی (سویت) سماج اور ریاست کے نظام کی کامرانی تھی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ زمانۂ امن میں سویت نظام ملک کی اقتصادی اور تہذیبی ترقی کے لئے بہترین اور مناسب ہے بلکہ زمانۂ جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے عوام کی قوتوں کو مجتمع کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔

مابعد جنگ کے زمانہ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ سویت سماج کتنا مضبوط ہے اور یہ کہ اس کی قوت ہمیشہ روبہ ترقی رہتی ہے۔ اس کی مثال جنگ کے بعد بحالی اور معیشی ترقی کی تیز رفتاری ہے۔ سویت محنت کش عوام کا مالی اور تہذیبی معیار مسلسل بلند ہوتا جا رہا ہے۔

بین الاقوامی معاملات میں سویت یونین کا وقار اور اثر بہت بڑھ گیا ہے۔ تمام دنیا میں امن، جمہوریت اور اشتراکیت کے لئے جد وجہد کرنے والی ترقی پسند قوتوں میں سویت ریاست سب سے پیش پیش ہے۔ تاریخ نے لینن اعظم کے ان الفاظ کو لفظ بہ لفظ ثابت کر دیا ہے کہ "سویت اقتدار کمیونزم کی جانب لیجانے والا راستہ ہے — یہ وہ راستہ ہے جسے محنت کش عوام نے دریافت کیا ہے اور اسی لئے یہی صحیح راستہ ہے اور اس پر گامزن قوتیں ناقابل تسخیر ہیں۔"

---

## (بقیہ صفحہ ۴۹)

کوشش کی ہے۔ جس طرف سے یہ الزام لگایا گیا ہے اُدھر سے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ کرشن نے خود کو فریق بنانے کے پہلو کو ہر جگہ گریز کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کہیں سے ہندو سمجھ لیا جائے، اس نے لاکھ بچنے کی کوشش کی لیکن اس کی نیت کو مشکوک نظروں سے دیکھا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ فساد کا موضوع اتنا نازک تھا اور حالات اس قدر قابو سے باہر ہو چکے تھے کہ توازن قائم کئے بغیر قلم نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا ورنہ فرقہ وارانہ جذبات اور بھڑک اُٹھتے۔ ایسی حالت میں مقصد فوت ہو جاتا۔ علاوہ ازیں، ادیب کو کسی ایک فرقے کی ترجمانی کے لئے مخصوص کر دینے کی خواہش، فرقہ وارانہ دماغ کی کار فرمائی ہے جن لوگوں نے اس موضوع پر ایک لفظ نہیں لکھا وہ مسئلہ کی نزاکت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

اردو میں فسادی ادب نے غور وفکر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھے بغیر نئے ادب کی پرکھ نہیں کی جا سکتی اُسے صحافت نگاری یا سوانح نویسی کہنے سے بھی کام نہیں چلے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ادب میں سیاسی انقلاب کے ساتھ نئے رجحانات آئے ہیں وہی ادب کو اچھی تخلیقات سے مالا مال کر سکتے ہیں۔ تنقید کا جس حد تک تعلق ہے ہمارے بڑے بڑے نقاد ادب کے اس نئے موڑ پر نظر جمائے ہوئے ہیں، وقت آنے پر یقیناً وہ اس بات کا لحاظ رکھ کر فیصلہ کریں گے۔

# ایماندار اُردو معمّہ ۴ ، پانصد (۵۰۰) روپیہ کے نقد انعامات

**ضرور غور سے پڑھئے** لمبی چوڑی انعامی رقمیں شائع کرکے ایمانداری سے انعامات تقسیم کرنا بہت مشکل ہے - اس معمّا کا جو نام رکھا گیا ہے بس وہی اس کی گارنٹی ہے - اس معمّا کے تین نمبر مسلسل نکل کر مقامی صورت میں کافی مقبول ہوئے ہیں - بعض اصحاب کے اصرار پر اتنی صاف اور ٹھوس چیز کو محدود نہیں رکھا جا سکتا - اب یہ معمّا ۴ پورے ہندوستان و پاکستان کے لئے جارہا ہے -

**خصوصیات** (۱) بہت سے معزز اصحاب کے دستخط شدہ کاغذ پر صحیح حل بنایا جاتا ہے - (۲) الفاظ بالکل اشارات کے مطابق ہوتے ہیں - (۳) صحیح حل صرف ایک معزز صاحب بناتے ہیں جو خود مالک معمّا بھی ہیں - اُن کی طرف سے حلفیہ بیان شائع کیا جاتا ہے کہ آخر دن تک صرف انہیں کے دماغ میں محفوظ رہیگا - (۴) صحیح حل کی سربمہر پٹی جناب نجم اللہ شاہ و سید اعجاز الدین صاحب جنرل مرچنٹ و آنریری مجسٹریٹ و سینیر وائس چیرمین میونسپل بورڈ کے حوالہ کر دی جاتی ہے ، جو دیانتداری اور امانت داری میں ایک مشہور و معروف انسان ہیں - صاحب موصوف از راہ کرم سربمہر پٹی کو اپنی عالیشان دوکان میں آخر دن تک نمایاں طور پر بحفاظت رکھواتے ہیں - آخری دن یہ پٹی پبلک بورڈ کے ذریعہ منگوائی جاکر سیکڑوں افراد کے سامنے کھولی جاتی ہے اور فوراً دستخط شدہ صحیح حل کا کاغذ نوٹس بورڈ پر لگا دیا جاتا ہے - انعامی رقم کم ضرور ہے لیکن فیس داخلہ بھی کم ہے - ہزاروں روپیہ کے انعامات بھی یہ معمّا ایمانداری سے تقسیم کریگا - لیکن آہستہ آہستہ - ایک وقت کی شرکت آپ کو اس کا گرویدہ بنادیگی -

**حل کرنیکا طریقہ :-** اشارات کی مدد سے خالی خانوں کو پُر کریں - **داخلہ کی آخری تاریخ ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء**

**اشارات**

(۱) جس میں یہ خوبی ہوتی ہے لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں -
(۲) ایسے شخص کی طبیعت عموماً گھبراتی رہتی ہے - (۳) اس کے لئے عدالت کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا ضروری ہے - (۴) یہ دل و دماغ کی کمزوری سے ہوتی ہے - (۵) اچھے کام کا یہ بھی اچھا ہوتا ہے -
(۶) اس کی بدولت بڑی سے بڑی مشکل حل ہوجاتی ہے -
(۷) بعض وقت اس کی بدولت انسان خاموش سا ہوجاتا ہے -
(۸) کسی کام کی انجام دہی پر کوئی یہ نہ ہو تو اُسے مجبور کرنا مناسب نہیں -
(۹) ہر ایک عورت میں کچھ نہ کچھ یہ ضرور ہوتا ہے -
(۱۰) ہندوستان میں اب اس قوم کے لوگ بہت کم باقی رہ گئے ہیں جن کے یہاں عام طور پر یہ معیوب نہیں -

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | | | ا | | ت |
| ۲ | ب | ے | | ا | ر |
| ۳ | و | | ا | | ت |
| ۴ | | | ش | ت | ✕ |
| ۵ | ا | ن | | ا | م |
| ۶ | ط | | ا | ت | ✕ |
| ۷ | | ے | ر | ت | ✕ |
| ۸ | | ر | ا | | ✕ |
| ۹ | ج | | ا | ل | ✕ |
| ۱۰ | | ا | چ | ✕ | ✕ |

پہلا انعام :- صحیح حل دو سو پچاس روپے - دوسرا انعام :- ایک غلطی ایک سو پچیس روپے
تیسرا انعام :- دو غلطی پچھتر روپے چوتھا انعام :- زائد حلوں پر پچاس روپے -

نوٹ :- اگر ایک سے زائد حل کسی انعام کے نکلے تو رقم مساوی تقسیم کردی جائیگی - (۲) براہ مہربانی اخبار یا رسالہ کا اپنے حل میں ضرور حوالہ دیں -

## شرائط!

(۱) سادے کاغذ پر جتنے حل چاہیں بنا کر بھیجیں۔ (۲) ایک سے زائد حل روانہ کرنے والے صرف الفاظ لکھ کر بھیج سکتے ہیں۔ (۳) زائد حلوں میں سے صرف ایک بہترین حل پر انعام دیا جاتا ہے۔ (۴) خوشخط لکھیں اور نقلیں ضرور رکھیں۔ دوبارہ چیک کرانے کی صورت میں عہ ر ادا کرنا ہوگا جو مطالبہ درست ہونے پر واپس کر دیا جائیگا اور انعام بھی دیا جائیگا۔ (۵) صحیح حل وہی سمجھا جائیگا جو ہمارے سربمہر حل کے ہو بہو مطابق ہوگا۔ (۶) مفصل اور مکمل نتیجہ اور تفسیر یکم مارچ ۴۹ء کے ہمارے پمفلٹ "دماغ" میں شائع کیا جائیگا۔ جس کے حاصل کرنے کے لئے مقامی حضرات کو فیس داخلہ کے ساتھ ا ر اور بیرونی حضرات کو ۲ ر زائد روانہ کرنا لازمی ہے ورنہ حل شریک مقابلہ نہیں کئے جائیں گے۔ (۷) کمپیٹیشن ایڈیٹر کا اس معمے کے متعلق ہر فیصلہ آخری اور قانوناً قابل قبول ہوگا۔ (۸) مقامی حضرات جمعہ کو بعد نماز اور روزانہ دس بجے دن سے شام کے چھ بجے تک باخذ رسید اپنے حل جمع کرا سکتے ہیں۔ بیرونی حضرات ذریعہ ڈاک۔ رقم فیس ذریعہ منی آرڈر یا بلا کراس کئے ہوئے پوسٹل آرڈرس سے روانہ کی جائے۔ رسید منی آرڈر وغیرہ ہر حالت میں حلوں کے ہمراہ آنا لازمی ہے۔ پاکستان والے صرف منی آرڈر روانہ کریں۔

نوٹ:۔ یائے معروف اور یائے مجہول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

**فیس داخلہ:۔ حل اوّل ۸ ر بعد کا ہر حل بشرطیکہ ایک ہی نام سے ہو صرف ۴ ر**

**پتہ:۔ ایماندار اردو معما۔ چوک۔ بھوپال**

---

# دیہاتی تفریحات

بھوپال کے میلہ جات اپنی خصوصیات کے لحاظ سے جو امتیاز رکھتے ہیں، وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں ——— حکومت ان میلہ جات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے اور دیہاتی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بطور خاص سرپرستی فرما رہی ہے۔

میلہ جات کی چند خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) بجلی کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ (۲) لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ قومی لیڈروں کی ریکارڈ کی ہوئی تقریریں سنائی جاتی ہیں۔ (۳) انسانوں اور مویشیوں کے لئے اسپتال قائم کئے جاتے ہیں اور حفظان صحت کے اصول بتائے جاتے ہیں۔ (۴) پیداوار زراعتی کی نمائش کیجاتی ہے۔ (۵) دیہاتی تفریحات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ (۶) بہترین مویشیوں پر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ صحیح زندگی کے نقشے آپکو صرف دیہات اور دیہات کی عوام میں ملیں گے۔ میلہ جات میں حصہ لے کر دیہاتی عوام کو اونچا اٹھائیے۔ حسب ذیل میلہ جات ہو رہے ہیں:۔

(۱) میلہ سلگن پور (تحصیل مردان پور) ۳۰ ر جنوری تا ۱۴ ر فروری ۱۹۴۹ء

(۲) میلہ شام پور (ڈیوڑھی عیشد گاہ) ۲۳ ر فروری تا ۶ ر مارچ ۱۹۴۹ء

**جمیل محمد خاں۔ اسپشل میلہ آفیسر۔ گورنمنٹ بھوپال:۔**